علیہ السلام

الامام

مولانا ادیب الہندی

سلسلۂ مطبوعات مجلس علماء واعظین

الامام

مولائے کائنات

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السّلام کی سیرت، سیاسی حریفوں کے مقابلے میں آپؑ کی منزلت۔ رسول اکرمؐ کے ارشادات سے آپ کی فضیلت۔ دشمنوں کے اقرار سے آپ کی عظمت اور مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی طبع زاد تصنیف المرتضیٰ کا ایک تحقیقی مطالعہ اور سراغِ حقیقت

مولانا ادیب الھندی

○ نام کتاب : ——— الامامؑ

○ مصنف : ——— حضرت مولانا ادیب الہندی

○ کاتب : ——— حسن اختر

○ مطبوعہ : ——— یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

○ صفحات ——— ۳۲۸

باراول : ——— ایک ہزار

——— : قیمت : ———

مجلد ——— ۱۰۰/ سو روپیے
غیر مجلد ——— پچاسی روپیے

ناشر :

مجلس علمائے واعظین، پوسٹ بکس نمبر ۵
چوک، لکھنؤ-۳
۲۲۶۰۰۳

انتساب

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا فَمَنْ
اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ

رسولِ اکرمؐ

میں شہرِ علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں جو علم
(کے حصول کا) ارادہ کرے وہ دروازے پر آئے۔

الامام علی المرتضیٰ

علیہ السّلام کے حضور میں

ادیب الہندی

AL-IMAM

الامام

علیؑ المرتضیٰ علیہ السّلام

۱۴۱۵ھ ——— ۱۹۹۴ء

اُردو	پہلا اڈیشن	لکھنؤ (ہند)
عربی	زیرِ طبع	قاہرہ (مصر)
فارسی	"	تہران (ایران)
انگریزی	"	نیو جرسی (امریکہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ
رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ
رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۝

——— المائدہ - ٦٧

فہرست

بابِ ششم

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل مجھ پر نازل ہوئے اور کہا: ان اللہ یقرئك السلام ویقول انی حرمت النار علی صلب انزلك وبطن حملك وحجر کفلك۔

"پروردگار سلام کے بعد کہتا ہے کہ میں نے آتشِ جہنّم حرام کردی ہے اس پشت پر جس نے آپ کو اُتارا۔ اس شکم پر جس نے آپ کا بار اُٹھایا۔ اس آغوش پر جس نے آپ کو کھلایا۔"

یہاں صاحبِ صلب سے مُراد جناب عبداللہ، صاحبِ شکم سے مُراد جناب آمنہ، صاحبِ آغوش سے مُراد جناب عبدالمطلب اور جناب ابوطالب ہیں۔

پھر جناب ابوطالب نے جو نعت نگاری کی وہ آپ کے ایمان کا اعتراف بھی ہے، اعلان بھی! کیوں کہ ایمان واسلام کے قبول واعتراف کے لئے نشر وتشہیر کی شرط کسی نے نہیں لگائی ہے۔ اعتراف جیسے نثر میں ہوسکتا ہے اسی طرح نظم میں بھی ہوسکتا ہے۔ اسی بنا پر شیخ ابوالقاسم بلخی اور ابوجعفر اسکافی جیسے اکابر علماء نے انھیں نعتیہ اشعار سے آپ کے ایمان پر استدلال کیا ہے۔ حق بھی یہی ہے کہ جناب ابوطالب نے اپنے ان اشعار میں اپنا دلی ایمان عالم آشکار اکر دیا ہے۔

آپ کے لامیہ قصیدے کی چند بیتیں یہ ہیں :۔

نقیم علی نصر النبی محمدا
نقاتل عنه بالقنا ذوالقبائل
وننصره حتی نصرع حوله
ونزھل عن ابنائنا والحلائل ؎۱

"ہم خدا کے نبی محمدؐ کی کمک ونصرت پر جمے رہیں گے اور ان کی طرف سے نیزوں کے ذریعہ قبائل کے تعاون سے قتال کریں گے۔

ہم خدا کے نبی محمدؐ کی مدد کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے اردگرد قتل کر دیے جائیں اور ہمیں ان کے آگے اپنے بیوی بچّوں کی بھی فکر نہ ہو گی۔"

کیا یہ شعر کسی کافر اور خدا و رسول کے منکر کے ہو سکتے ہیں اور ایسا عزم بالجزم کوئی منکر خدا و رسول کرے گا؟

ایمان ابوطالب کے سلسلے میں ابن ابی الحدید نے جناب ابوطالب کا یہ کلام بھی نقل کیا ہے اور کیا اس سے بڑھ کے اور واضح ثبوت بھی ہو سکتا ہے ؎

یا شاھد اللہ علی فاشھد
انی علی دین النبی احمد

؎۱ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۴۹ بدایۃ النہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۵۷

من ضل فی الدین فانی مھتد[۱]

"اے اللہ کے گواہ میری گواہی دے کہ میں دین احمد پر رہوں
دین میں کوئی گمراہ (ہوتو ہو) میں تو ہدایت یافتہ ہوں"۔

کیا اس کے بعد بھی ابوطالب کے ایمان و اسلام میں شک و شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ کیا یہ شعر کہنے والا کافر سمجھا جائے گا؟ اور وہ بھی اس حالت میں کہ کفر کی کوئی دلیل بھی نہیں۔

اب اگر "بحث برائے بحث" کے اصول پر منظوم اقرار کو ماننے کے لئے نہ تیار ہوں تو کوئی بات نہیں۔ تاریخ کا دامن اور ہماری نظر نثر سے خالی و قاصر نہیں ہے۔ چنانچہ عرض یہ ہے کہ سیّد محمد برزنجی حافظ ابونعیم اور بیہقی نے نقل کیا ہے کہ:

"ابوجہل اور عبداللہ ابن ابی امیہ وغیرہ سردارانِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ مرض الموت میں جناب ابوطالب کی عیادت کو آئے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب سے کہا کہ لاالہ الا اللہ کہیے تاکہ خدا کے سامنے گواہی دوں۔ اس پر فوراً ابوجہل اور ابن ابی امیہؔ نے کہا:

اے ابوطالب! کیا آپ عبدالمطلب کی مِلّت سے پلٹ

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۳۱۵

جائیں گے ؟ اور بار بار یہی کہا۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا :
"تم لوگ جان لو کہ ابوطالب عبدالمطلب کی ہی مِلّت پر ہے"۔
چنانچہ وہ لوگ خوش خوش واپس چلے گئے۔ ادھر آنجناب پر موت کے آثار ظاہر ہوئے، تو ان کے بھائی عبّاس نے جو سرہانے بیٹھے تھے، دیکھا کہ آپ کے لب جنبش میں ہیں۔ عبّاس کان ہونٹوں کے قریب لے گئے تو سنا کہہ رہے تھے "لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہ"۔ عباس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا :

"اے بھتیجے! واللہ لقد قال اخی الکلمۃ اللتی امرتہ بھا۔[1] بخدا میرے بھائی (ابوطالب) وہی کہہ رہے ہیں جس کی تم نے ان سے فرمائش کی تھی"۔

یہ بات بھی فراموش نہ ہو کہ وقت آخر کلمہ پڑھوانا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ جس سے کلمہ پڑھوایا جا رہا ہے وہ کافر ہے کیوں کہ وقت آخر ہر مسلمان کو یہ کلمہ پڑھنا ہی چاہیئے اور ہر مسلمان کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ یہ کلمہ دُہراتا رہے کہ خاتمہ اسی کلمہ پر ہو۔ غالباً یہی وجہ ہوگی جس سے رسُولِ مقبول نے اپنے مُربّی چچا سے اس کی فرمائش کی اور آپ نے جاتے جاتے اپنی زبانِ مُبارک

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۴۶ ، سیرۃ النبی ؐ : شبلی جلد اوّل

سے اس کلمہ کو دُہرایا۔ ورنہ کافر سے وقتِ اخیر کلمہ پڑھنے کی تلقین ایک امرِ مستحب قرار پاتا! کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی اور بھی کافر سے وقت آخر کلمہ پڑھنے کو کہا؟ یا ہمیشہ صرف مسلمانوں ہی سے اس کا مطالبہ کیا۔ اور بحمداللہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

ایمان ابوطالب پر اتنی ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ مزید شہادت کے لیے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جو آپ کے کفر کا دعوے دار ہے وہ ثبوت لائے۔

آخر کسی کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ اگر ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم خیال وہم عقیدہ نہ تھے تو پھر آپ نے وہ راہ کیوں نہ اختیار کی جو جناب ابراہیم خلیل اللہ کے ساتھ آذر نے اختیار کی تھی کہ ادھر ابراہیم علیہ السلام نے دعوتِ حق دی ادھر آذر نے دور دفعان ہو جانے کا حکم دیا!!

آخر اتحادِ عقیدہ کے سوا ابوطالب کو کون سی چیز مانع تھی کہ کفارِ قریش کا ساتھ نہ دیں اور اپنی کفالت کا حق جتاتے ہوئے تبلیغِ حق کی رسول کو ممانعت نہ کریں۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوطالب کو آکر بتاتے ہیں کہ :——

ان اللہ امرنی باظہار امری ....

...... فما عندك یا عم

"خداوندعالم نے مجھے اپنا معاملہ کھول دینے کا حق دیا ہے اور اپنا نبی بنایا ہے۔ اب آپ کیا سوچتے ہیں چچا؟"

تو یہ قریش کا راس و رئیس، بنی ہاشم کا سردار، اہالی مکہ کا معزز ترین بزرگ اور نافذ الکلمہ، مقبول القول، پیغمبر کا کفیل یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ ان کے دین کے خلاف نئے دین کا داعی کوئی پرایا نہیں، گھر ہی کی ایک فرد، خود ان کی زیر کفالت پلنے والا ہے۔ ابوطالب مخالفِ حق ہوتے تو پتہ نہیں کہ منع و مخالفت میں کیا کیا کہتے اور کیا کیا کرتے۔

لیکن ———

وہ تو مدح سرائی کرتے ہیں۔!

ہمّت بڑھاتے ہیں۔!!

بلا شرط حمایت کی زبان دیتے ہیں ———!!!

ملاحظہ ہو:

اخرج ابن اخی فانك الرفیع کعبًا
والمنبع خرمًا والاعلیٰ ابا واللہ الخ

"فرزند برادر! اٹھ کھڑے ہو (تمھارا کیا کہنا) یقینًا قبیلے کے لحاظ سے بلند، گروہ کے لحاظ سے مضبوط، نسل و خون کے

اعتبار سے بزرگ و بہتر ہو۔ خدا کی قسم جو زبان تم کو سخت و سست کہے گی میں تیز و تند زبانوں اور تیز دھاروں والی تلواروں سے اس کا جواب دوں گا۔ قسم بخدا سارا عرب تمھارے سامنے یوں گھٹنے ٹیک دیگا جس طرح جانور مالک کے سامنے عاجز و بے چارہ رہتے ہیں۔"

ایک اور واقعہ جس کی اصبغ بن نباتہ نے امیر المومنینؑ سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

" ایک دن رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے جس نے اونٹ نحر کیے تھے، مگر آپ نے ان پر سلام نہیں کیا۔ جب آپ دار الندوہ پہونچے تو قریش نے کہا:

لو اور سنو۔ یتیم ابو طالب ہماری طرف سے گزرتے ہیں تو سلام بھی نہیں کرتے۔ کوئی ہے جو ان کی نماز چوپٹ کر دے۔؟

عبد اللہ الزبعری نے کہا، ہاں ہاں۔ میں ابھی جاتا ہوں اور ایسا کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ گیا اور حضور حالت سجدہ میں تھے کہ آپ پر غلاظت پھینک دی۔ پیغمبرؐ چچا کی خدمت میں آئے اور شکایت کی۔

پوری تفصیل سننے کے بعد جناب ابو طالب نے

دریافت کیا: " آخر وہ ہیں کہاں ؟ "

فرمایا: " یہیں ابطح میں موجود ہیں۔"

حضرت ابوطالب نے پکارا: " اے آل عبد المطلب، اے آلِ ہاشم، اے آل عبد مناف! کہاں ہو، آؤ۔" اب کیا تھا لبیک لبیک کی صدا کے ساتھ گھروں سے نکلنے لگے۔

جب قریش نے دیکھا کہ ابوطالب شمشیر برہنہ لیے آرہے ہیں تو اٹھنے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوطالب نے للکارا:
" اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گردن توڑ دوں گا"
پھر آپ نے پیغمبرؐ سے پوچھا:
" تمھیں کس نے ستایا تھا ؟ "
آپ نے ابن الزبعری کی طرف اشارہ کیا۔

جناب ابوطالب نے اسے اپنے پاس بلایا اور گھونسہ اس کے کان پر اس زور سے مارا کہ ناک سے خون جاری ہوگیا اور پھر اس پر جناب حمزہ سے نجاست ڈلوائی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شرف کفار سے بیان کیے۔ پھر آنحضرت کی مدح میں اشعار سنائے جس میں یہ شعر بھی تھا جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

"تم خدا کے نبی ہو، تم ذی عزت اور سردار ہو، تم پاک اصل، تمھارے والدین بزرگ اور پاک اصل ہیں[1]۔"

ولقد علمت بان دین محمّد
من خیر ادیان البریۃ دیناً[2]

"میں جانتا ہوں کہ بیشک محمدؐ کا دین تمام ادیان سے بہتر دین ہے۔"

اور ابو طالب کا یہ کہنا کہ:

الم تعلموا انا وجدنا محمّداً رسولاً کموسیٰ
صح ذالک فی الکتب[3]

"کیا تم نہیں جانتے کہ ہم نے محمّد کو ویسے ہی نبی پایا ہے جیسے موسیٰ اور یہ بات کتب الٰہیہ سے ثابت ہے۔"

کیا ان شہادتوں کو صرف اس لیے نظری کر دیا جائے گا کہ ابو طالب انھیں "مرتضیٰؑ" کے والد بزرگوار ہیں، جن کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے جناب ندوی صاحب نے تاریخ کا وہ سب کوڑا کرکٹ جمع کر دیا ہے جس سے حضرت علی مرتضیٰؑ کے

---

[1] نزہۃ المجالس ج ۲ صـ ۱۲۲ الشیخ عبدالرحمٰن الشافعی

[2] تاریخ ابو الفدا ج ۱ صـ ۱۲۰، اصابہ فی تمیز الصحابہ جز الرابع صـ ۱۱۵، سیرۃ ابن ہشام ج ۱ صـ ۲، خزینۃ الادب عبدالقادر بغدادی ج ۱ صـ ۲۵۱، بدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ صـ ۵۷، [3] تاریخ خمیس ج ۱ صـ ۳۴۰، اسنی المطالب صـ ۶

فضائل میں تخفیف ہوتی ہو ؟

ہے نا یہی بات ! ورنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے کفیل و مددگار اور ہر موقع پر سینہ سپر ہونے والے کے اسلام میں شک کیوں ؟؟

رسولؐ اللہ کی نیابت

مصنّف بزرگوار نے جیساکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کہ یہ کتاب ایک "مظلوم شخصیت" کے ساتھ انصاف کرنے کے وعدے کے ساتھ پیش کی ہے۔ لیکن یہ کتاب قول و فعل کے جس تضاد کا شاہکار ہے اس کی طرف ہم پہلے بھی اشارات کرتے آئے ہیں، اور آگے بھی مصنّف کے کمال کی داد دیتے رہیں گے۔ لیکن بڑے امعان نظر سے ان احادیث کو قلم انداز کیا گیا ہے جن کے بغیر مولا مشکل کُشا علیہ السّلام کے اس رتبہ کا ادراک ہو ہی نہیں سکتا، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں آپ کا تھا اور جس کا اظہار برملا فرمایا کرتے تھے۔

جناب مولانا اگر انھیں روایات کو قلم انداز کرتے جو محض امامیہ مجامیع میں منقول ہوئے ہیں اور طرق اہل سنّت سے ان کی تائید نہیں ہوتی تو ہم اپنے ایراد کو بے جا سمجھتے۔ لیکن غضب تو یہ ڈھایا گیا ہے کہ فضائلِ مولائے کائنات علیہ السّلام کی وہ حدیثیں بھی

دیباچہ

رُوئے ارض پر اس وقت اسلام جس طرح سے بیگانوں کے کھُلے ہوئے اور یگانوں کے کھُلے اور ڈھکے دونوں طرح کے حملوں کی زد پر ہے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پڑھا لکھا اور باخبر حلقہ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے توسّط سے صُورتِ حال کا ادراک کسی زحمت کے بغیر کرسکتا ہے

ایسے میں ضرورت تھی کہ کم سے کم ہندوستان کے کلمہ گو متحد رہتے اور ایسے مسائل کو نہ چھیڑتے جن کے ذکر سے کوئی معقول یا معنوی فائدے کی شکل کا برآمد ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسلام کے تہتّر فرقوں کے عقائد کے اختلافات کا اپنا پس منظر ہے جس کی تفصیل میں ہم جانا نہیں چاہتے اندیشہ ہے ع

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

لیکن کیا کیا جائے کہ اس نکتہ کا لحاظ ہمارے وہ اکابر نہیں فرماتے ہیں جنھیں اسے سب سے زیادہ سمجھنا اور ماننا چاہئے تھا کیوں کہ وہ

سامنے نہیں لائی گئیں جنھیں ثقہ محدثین عامہ نے پیش کیا ہے مثلاً خوارزمی نے اپنی مناقب میں مجاہد کے واسطے سے حضرت ابنِ عباس سے یہ روایت نقل کی ہے :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لوان الریاض اقلامٌ والبحر مدادٌ والجنّ حسابٌ والانس کتابٌ ما احصوا فضائل علی بن ابی طالب ؑ [1]

جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر روشنائی بن جائیں اور جنّات حساب کرنے والے ہوں اور انسان لکھنے والے ہو جائیں تب بھی فضائل علی بن ابی طالبؑ کا احصیٰ نہ کر سکیں گے۔"

اس بات کو سرور کائناتؐ نے ایک اور حدیث میں فرمایا ہے :

ان اللہ تعالیٰ جعل لاخی علی بن ابی طالب فضائل لاتحصی کثرتہ

" خداوند عالم نے میرے بھائی علی ابن ابی طالب کو اتنے فضائل عنایت کیے جن کی کثرت کا احصیٰ نہیں کیا جا سکتا۔"

---

[1] القطرہ من البحار مناقب النبی والعترۃ ص ۱۳۹

حیرت ہی نہیں تاسّف کی جگہ ہے کہ جناب مولانا ایسا جیّد و جلیل عالم غیر جانب دارانہ انداز میں مولائے کائنات کی سوانح لکھے اور فضائل و مناقب کے وہ انبار ڈھکراتا ہوا نکل جائے، جو حضرت علمائے عامّہ نے لگا رکھے ہیں۔ اتنا بھی ہوتا تو ہم مولانا کی عمر، حد سے بڑھی ہوئی مشغولیت، مہماتِ ملّی اور مسائلِ ملکی کے باعث فکرمندی و پریشاں خاطری کو اس کا سبب سمجھ کر زبان ایراد بند کر لیتے۔ لیکن غضب تو یہ ہے کہ فضائل کو مجروح و مشتبہ کرنے والی چیزیں جن مدارک سے لی گئی ہیں ان کے روشن پہلو کے ساتھ شپرہ چشمی سے کام لیا گیا ہے، جیسے ابنِ سعد کی طبقات اور حاکم کی مستدرک اور ابنِ ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ وغیرہا وغیرہا۔ ان سبھی مدارک میں سورہ برأت کا واقعہ تفصیل کے ساتھ درج ہے ان کے علاوہ کنز العمال میں بھی نقل ہوا ہے ملاحظہ فرمائیں:

ثم قال لعلی الحقہ ورد علی ابی بکر وبلغھا انت "ففعل" فلما قدم ابوبکر بکیٰ وقال یارسول اللہ حدث فی شئ فقال ما حدث فیك الا خیرٌ ولکن امرت ان لا یبلغہ الا انا او رجل منّی۔

"جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: جاؤ ابوبکر تک پہنچو۔ ابوبکر کو میرے پاس واپس کردو اور تم خود اس سورہ کی تبلیغ کرو۔ علیؑ نے ایسا ہی کیا اور جب ابوبکر پیغمبرؐ کے پاس واپس پہونچے تو گریہ کیا اور کہا کیا میرے خلاف کوئی چیز آئی ہے؟ پیغمبرؐ نے فرمایا تمھارے لیے خیر کے سوا کچھ اور نازل نہیں ہوا لیکن مجھے حکم دیا گیا کہ یہ تبلیغ خود کروں یا وہ شخص جو مجھ سے ہو"

اور امام احمد بن حنبل نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ:

ان النبی بعث برأت مع ابی بکر فلما بلغ ذی الحلیفۃ قال لا یبلغھا الا انا او رجل من اھل بیتی فبعث بھا مع علیؑ۔

"جب رسولؐ اللہ نے سورۂ برأت دے کر ابوبکر کو بھیجا اور جب وہ (میقات) ذوالحلیفہ تک پہونچے تھے تو آپ نے فرمایا اس سورہ کو یا میں پہونچاؤں یا جو میرے اہل بیت میں سے ہو پس اس سورہ کو علیؑ کے ذریعہ روانہ کیا۔"

عن علی لما نزلت عشرۃ آیات من برأت

فبعث بها النبی مع ابی بکر یقرؤها علی اهل مکۃ ثم دعانی فقال ادرک ابا بکر فحیثما لقیت فخذ منه الکتٰب فرجع ابابکر وقال .... الخ

"حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ جب سورۂ برات کی دس آیتیں نازل ہوئیں تو رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ابوبکر کے ذریعہ ان آیات کو مکہ روانہ کیا کہ وہ وہاں پڑھی جائیں پھر مجھے طلب کیا اور کہا ابوبکر تک پہونچو اور جب ملاقات ہو تو ان سے سورۂ برأت لے لو اور ان آیات کو تبلیغ تم کرو۔ پس ابوبکر واپس ہوگئے اور کہا ..."

حبیب السیر کے مصنّف نے اس ذیل میں سرکار رسالت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے حضرت ابوبکر کے مکالمے کی روایت یوں کی ہے:

"چون امیر المومنین ابوبکر بملازمت حضرت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام رسید از آنحضرت پرسید کہ یا رسول اللہ از من چہ صادر شد کہ از قرأتِ سورۂ برأت ممنوع گشتم۔ رسول اللہ ص فرمود: ہیچ منقصتی بحال تو راہ نیافتہ ولکن ہبط" الخ

یعنی: "جب امیر المومنین ابوبکر (راستہ سے واپس ہوکر) رسول خدا

کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ سے سوال کیا: سو مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی جو سورہ برأت کی تبلیغ سے روک دیا گیا؟ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی، مگر جبرئیل نازل ہوئے ....'' الخ

اس کے علاوہ تاریخ ابوالفدا، ارجح المطالب، شاہ ولی اللہ کی قرۃ العینین، سبط بن جوزی، تاریخ کامل، تاریخ الامم والملوک محمد بن جریر طبری، جلال الدین سیوطی وغیرہ سب ہی نے تو اس واقعہ کو قلم بند کیا ہے۔ مگر جناب ندوی صاحب نے کسی پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ بس ایک حوالے سے اپنے مطلب کی چیز لے لی:

''تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے۔؟''

حضرت علی نے فرمایا: ''مامور کی حیثیت سے''[1]

ہم مصنف بزرگوار سے ہی انصاف چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کسی محقق کے لئے یہ شایانِ شان ہے کہ سب حوالوں کو نظر انداز کر کے محض اپنے مطلب کی بات بھی لے اور تمام حوالوں کو ''گاؤخرد

---

[1] المرتضیٰ ص ۸۷

دریا برد" کر دے۔ لیکن کہاں تک احتجاج کیا جائے۔ یہی انداز خانۂ کعبہ میں ولادت کے سلسلے میں بھی اختیار کیا گیا۔

ہم پھر اصل مطلب کی طرف آتے ہیں اور مؤدبانہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ بات عقل وفہم میں آتی ہے کہ حکم خداوندی کی تعمیل میں رسُول کی نیابت اور قرآنی احکامات کے سنانے کی اجازت کسی سے سلب کرلی گئی ہو اُسے امیر کے منصب پر برقرار رہنے دیا جائے اور جسے احکام قرآن سنانے کا منصب بھی سونپا گیا ہے اور نیابتِ رسول کے شرف سے بھی مزین کیا گیا ہو اسے ماتحت و مامور بنا دیا جائے۔؟

یہاں پر یہ بھی سوال اُٹھتا ہے کہ اگر حضرت ابوبکر کی معزولی کلّی طور پر نہیں تھی تو پھر رونے کا کیا محل تھا؟ اور یہ سوال کس لیے تھا کہ "کیا میرے بارے میں کچھ آیا ہے۔ اب امیر کون رہا؟"

مولانا ندوی صاحب نے محض نقلیات سے ناانصافی نہیں کی ہے بلکہ عقلیات کا بھی جی بھر کے مذاق اڑایا ہے۔ شاید مولانا کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ مریدین خوش عقیدہ کے سوا یہ کتاب کسی اور کی نظر سے نہیں گزرے گی، ورنہ عقلی پہلو کو اس طرح پامال نہ فرماتے۔

بہر حال اس تاریخ ساز واقعہ کا خاص پہلو یہ ہے کہ جب سورۂ برائت کی دس آیتیں نازل ہوئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو منظور ہوا کہ حج کے موقع پر ان کی تبلیغ کی جائے اور اس خدمت کے لئے حضرت ابو بکر کو منتخب فرمایا۔ لیکن ان کی روانگی کے بعد ہی جبرئیل آئے اور یہ حکم پہونچایا کہ تبلیغ کا کام آپؐ بہ نفس نفیس کریں یا آپ کے اہل بیت کی کوئی فرد کرے۔

اس حکم سے مطلع ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولائے کائنات علی علیہ السّلام کو طلب کیا اور اپنے خاص ناقہ سے روانہ کر کے فرمایا کہ "جاؤ اور ابو بکر سے سورۂ برأت لے کر خود تبلیغ کرو"

حضرت علی علیہ السلام نے دار الحلیفہ کی منزل پر حضرت ابو بکر کو پالیا اور ان سے سورۂ برأت لے لیا۔

حضرت ابو بکر خدمتِ رسول میں مدینہ واپس آئے اور شکوہ و استعجاب کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا کوئی حکمِ خدا میرے خلاف نازل ہوا ہے؟

اور پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا کیا جائے جبرئیل یہ حکم لائے تھے کہ سورہ برأت کی تبلیغ میں خود کروں، یا علیؑ۔

آپ یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ اس روایت کے راویوں میں خود حضرت علیؑ، ابو سعید خزرمی، ابن عمر، ابورافع، انس بن مالک جیسے مشہور راوی ہیں۔

۳

باب سوم

- حجۃ الوداع
- واقعۂ غدیر
- حسّان بن ثابت
- شاہ علی حسنی جائسی
- اصحاب کی وفاداری
- صحیح بخاری کی ایک روایت
- وفاتِ رسول ص
- جنابِ سیّدہ کا گریہ
- سجدہ گاہ
- پیغمبرِ اسلام ص

حجۃ الوداع کا ذکر اور خطبے سے چشم پوشی

جناب ندوی صاحب کا شبدیز قلم اسی راہ پر سرپٹ رواں ہے۔ ——— ایسا لگتا ہے کہ منزلِ مقصود یعنی حضرت کے واقعی فضائل کو کم قیمت اور بے وقعت بنانے کی سعی میں مولانا گرد و پیش پر طائرانہ نظر بھی نہیں ڈالنا چاہتے۔ اب آیئے حجۃ الوداع کے ذکر میں مولانا کے کمال کا جائزہ لیا جائے۔

جناب ندوی صاحب نے حجۃ الوداع کا ذکر تو خیر کیا لیکن اس موقع پر پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خطبہ دیا اور جن احکام کی تبلیغ فرمائی، اس کے ذکر کی ضرورت آپ نے محسوس نہیں کی۔ کیوں کہ یہ خطبہ اور احکام خاص عینک سے نظر ہی نہیں آسکتے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سقیفہ کی راہ مسدود فرما رہے تھے۔

مولانا کچھ تو اور ملاحظہ فرماتے۔ کم از کم اس مستدرک کو تو دیکھ لیتے جس سے خانۂ کعبہ میں ولادت کے سلسلے میں اپنی مراد پوری کر چکے تھے۔ وہاں غدیر سے الگ کر کے بریرہ اسلمی کی روایت لکھی گئی ہے۔ یعنی اس بارے میں حضور نے اظہار خیال و انتباہ

مسلمانانِ ہند ہی میں نہیں، عالم اسلام میں قائدانہ و مرشدانہ حیثیت کے دعوے دار ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے اس معذرت کے ساتھ کہ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کی کوئی مستند سیرت دُنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی اور اس کمی کی تلافی کے لئے المرتضیٰ تصنیف فرما رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

ہوا یہ کہ جناب مولانا نے صحیح معنیٰ میں کتاب تصنیف کی جسے آپ طبع زاد کہیں تو ہرگز خلافِ واقعہ نہیں۔ مولانا نے بڑا اہتمام فرمایا ہے کہ درایت سے روایت کا مواجہہ دُور دُور نہ ہونے پائے اس لئے مولانا نے وصف نما الفاظ میں حضرت امیر المومنینؑ کے فضائل سلب کرنے کا اہتمام فرمایا ہے جو چیزیں کسی معنیٰ میں اختلافی نہ تھیں ان کے رد و نقض کے لئے بھی وہ نہایت دُور از کار روایتوں کی تلاش میں کامیاب ہوئے۔

ان ناچیز سطروں میں پیشِ نظر محققانہ کتاب کے مضامین کا جوہر پیش کر کے متن کتاب کو آپ کے لئے بے لطف بنانا مقصود نہیں بلکہ وہ صُورتِ حال جسے مولانا کی چیرہ دستی نے تاریخی آب و رنگ دے دیا ہے، ان میں سے چند کا حوالہ دیئے بغیر

غدیر کے لئے نہیں چھوڑ رکھا تھا۔ پھر آپ نے غدیر پر وارد ہونے کا ذکر کیا۔ لیکن مولائے کائنات کے سلسلے میں مشہور روایت کو بعینہ الفاظ نقل کرنے کے بجائے من مانے ترجمے پر اکتفا فرمائی۔ اتنی فراخ دلی البتہ برتی کہ دُعائیہ کلمات بعینہٖ ذکر کر دیے "المرتضیٰ" کا صفحہ ۸۸ ملاحظہ ہو:

"جب آپؐ غدیر خم پہونچے تو وہاں ایک خطبہ دیا اور اس میں حضرت علیؑ کی خصوصیت اور شان کا ذکر فرمایا آپ نے فرمایا: میں جس کا دوست اور حامی ہوں، علی اس کے دوست اور حامی ہیں۔ پھر دُعا دی: اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ۔"

ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے کم از کم غدیر کے نفسِ واقعہ کو تو تسلیم کیا اور ابن تیمیہ والوں کا وہ مخصوص انداز اختیار نہیں کیا کہ واقعہ کا ہی سرے سے انکار کر دیا جائے اور اسے ایک بے ربط اور غیر متعلق چیز ٹھہرایا جائے۔

لیکن پھر بھی کمالِ احتیاط سے کام لیا۔ اس پیش کش سے جو گزند پہونچی تھی، اس کی تلافی ترجمے میں کر دی۔ یعنی مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ کا ترجمہ فرماتے ہیں: "میں جس کا دوست اور حامی ہوں، علی بھی اس کے دوست اور حامی ہیں۔"

بہت سامنے کا سوال ہے۔ یہ دوست اور حامی کیا لفظ واحد کے دو معنیٰ ہیں۔ یا حدیث شریف کی دو لفظوں کے الگ الگ معنیٰ ہیں؟ اگر لفظ ایک ہی ہے تو پھر آپ حضرات کا وہ ادّعا کہاں گیا کہ یہ لفظ کثیر المعنیٰ ہے۔ یہاں دو ہی پر اکتفا کیوں؟ اور پھر یہ کہ لفظ مشترک ایک ہی وقت میں اپنے متعدد معنیٰ میں بہ شکل مفرد استعمال ہوسکتا ہے؟ اگر ان سوالوں کا جواب مثبت ہے تو یہ ارشاد ہو کہ شرط کے ساتھ یا بلا شرط۔ اگر کوئی شرط ہے تو کیا ہے؟

جناب مصنّف جس مرتبہ اور بزرگی پر فائز ہیں اس کی روشنی میں ان کی خدمت میں کوئی ایسی گزارش جس میں اصلاح کا پہلو نکلتا ہو، یقیناً سوئے ادب کے دائرے میں آتی ہے۔

اس لیے یہ طالب علمانہ سوال ہے کہ اگر احتیاط ہی مقصودِ خاطر تھی تو 'دوست' ہی کافی تھا۔ یہ 'حامی' کے الحاق کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔؟ ایسا تو نہیں کہ یمن کے واقعے سے اس حدیث کو جوڑنے کے لئے ترجمے میں یہ چابکدستی دکھائی گئی ہے۔!؟

ترجمہ کے فن سے مبتدیانہ ربط وضبط رکھنے والے بھی اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ لفظ مشترک کے ترجمے میں سب سے بڑی اہمیت قرینۂ مقام کی ہوتی ہے اور اس قرینے کی تلاش میں آپ صاحبِ تحفۂ

اثنا عشریہ کے تتبع میں یمن پہونچ گئے۔ لیکن جو قرینے برمحل اور پیش پا افتادہ تھے، ان پر آپ نے توجہ دینا مناسب نہیں جانا؟ بات اگر یمن ہی کے ایک معمولی مسئلے سے متعلق ہوتی تو کیا غدیر کے اجتماع کے لئے اس اہتمام کی ضرورت تھی اور اگر نعوذ باللہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرابت و جنبہ داری میں اتنا مبالغہ فرما سکتے تھے تو پھر اللہ پاک نے بھی آیۂ بلّغ کو اتنا تاکیدی رنگ کسی جنبہ داری کے ماتحت عطا کیا۔ جنابِ والا کا مسلک کیا ہے؟

ایک بڑا بنیادی سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ رسول مقبول اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری دور میں پچھلی باتوں کا تدارک فرما رہے تھے یا اپنے بعد کے انتظامات فرما رہے تھے؟

یہ بھی طالب علمانہ استفسار ہے۔ ان اللہ مولائ وانا ولی کل مومن کا ترجمہ بھی آپ یہی فرمائیں گے کہ "اللہ میرا دوست اور حامی ہے اور میں ہر مومن کا دوست اور حامی ہوں۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ اہلِ بیت علیہم السلام کو ان کے مقام سے فروتر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کا انجام کہاں تک پہونچا ہے۔ یمن کا واقعہ بیشک قرینے میں ملتا ہے۔ لیکن اتنے اہم اور مستحکم متیقن قرائن کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مستدرکؔ تو آپ کی

معتبر کتاب ہے۔ ولادتِ مولا علیؑ خانہ کعبہ میں ہونے کے سلسلے میں، آپ نے آپنے نقطۂ نظر کے اثبات کے لئے اسی کا سہارا لیا ہے۔ یہاں اسے آپ نے کیوں نظر انداز کر دیا؟ وہاں تو بریدہ اسلمی کی روایت غدیر سے الگ کر کے لکھی گئی ہے۔ یعنی پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم غدیر سے پہلے اس وقت بھی جب بریدہ اسلمی یمن سے واپس آئے تھے اور شکوہ سنج ہو رہے تھے، اسی موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اسی حدیث کو بیان فرمایا تھا۔

اور یہی دو مواقع نہیں، حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اور موقعوں پر بھی اس حدیث کا اعادہ اور تکرار کی ہے کہ جیسے مولائے کائنات حضرت علی علیہ السّلام کے حالتِ رکوع میں سائل کو انگوٹھی دینے کے بارے میں علاّمہ جلال الدین سیوطی، طبرانی اور ابن مردویہ کے حوالے سے حضرت عمّار بن یاسرؓ سے نقل کرتے ہیں:

وقف بعلی سائل هو راکعٌ فی صلوٰۃ تطوع فنزع خاتمہ فاعطاہ السائل فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیه واٰله وسلم فاعلمه ذٰلك فنزلت

علی النبی ھذہ الایۃ انما ولیکم
اللہ ورسولہ والذین یقیمون الصلوٰۃ
ویوتون الزکوٰۃ وھم راکعون ط
فقراھا رسول اللہ علی اصحابہ ثم
قال من کنتُ مولاہ فعلی مولاہ اللھم
وال من والاہ عاد من عاداہ [1]

"حضرت علی علیہ السلام جب نماز پڑھ رہے تھے تو ایک سائل آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اپنی انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور اس واقعہ کی خبر دی گئی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ نے تمام اصحاب کو یہ آیت سنائی اور پھر فرمایا: جس کا میں مولا اس کا علی مولا۔ خداوندا اس کو دوست رکھ جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو علی سے دشمنی کرے۔"

تاریخ حبیب السیر میں غدیر کا پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ ــــــــ

"پس امیر المومنین کرم اللہ بموجب فرمودہ

---

[1] الدر المنثور جز الثانی ص ۲۹۳

حضرت رسالت مآب در خیمہ نشست تا طوایف و خلائق
بملازمتش رفتہ لوازم تہنیت بہ تقدیم رسانند
و از جملہ اصحاب امیر المومنین عمر بن خطاب جناب
ولایت مآب را گفت بخٍ بخٍ یا ابن ابی طالب اصبحت
مولای و مولیٰ کل مومن و مومنة یعنی
خوش حال تو اے پسر ابی طالب بامداد کردی در وقتیکہ
مولائے من و مولائے کل مومن و مومنہ بودے۔ بعد ازاں
امہات مومنین بحسب ارشاد سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ
بخیمۂ امیر المومنین رفتہ شرط تہنیت بجا آوردند"۔[1]

عمر ابنِ خطاب کا اس انداز سے مبارکباد دینا یا اُمّہاتِ اُمّت
سے پیغمبرؐ کا یہ ارشاد کہ جاؤ اور علیؑ کو تہنیت دو، کیا صرف اتنی سی بات
بات پہ تھا کہ میں جس کا دوست اور حامی ہوں، علی بھی اس کے
دوست اور حامی ہیں۔ فاضل مصنّف کی عمر اور عظمت قدم قدم پر
سدِّ راہ ہے۔ ان سطروں کی تسوید میں جس کش مکش کا سامنا ہے
اسے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ فاضل اور بزرگوار مصنّف نے اپنے نشان
تک پہونچنے کے لئے کس بے احتیاطی اور ضعیفانہ لغزش سے کھائیے

---

[1] حبیب السیر ج ا ص۔

یار کیے ہیں حضرت ندوی یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرام میں بس علیؑ ایک ایسے تھے کوئی اور نہ تھا جس میں یہ وصف پایا جاتا کہ پیغمبر جس کے دوست اور حامی ہوں وہ صحابی بھی اس کے دوست اور حامی ہوں۔

یہاں سید المرسلین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں کہ صحابہ کے اتنے انبوہِ کثیر میں صرف حضرت علی علیہ السّلام ایسے تھے جو ان کے دوست اور حامی تھے۔ جس کے دوست اور حامی خود سرورِ کائنات تھے۔ ہم کوئی گستاخی نہیں کر رہے ہیں یہ حضرت مصنّف کے ارشاد گرامی کا جو منطقی نتیجہ ہے اسے منظر عام پر لارہے ہیں یا پھر جناب مُصنّف کی مُراد خدانخواستہ یہ ہو کہ یمن والوں کے الزامات مولائے کائنات کے خلاف ایسے سنگین تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دفع فرمایا۔ اسی خوشی میں حضرت عمر کو بخٍ بخٍ کا نعرہ لگانا پڑا۔

ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کے علاوہ اور کوئی محرک نہیں ہوسکتا کہ فاضل مصنّف واقعہ کو اس انداز میں پیش فرمائیں۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ یمن کا واقعہ بہت معمولی چیز تھی اور اس کے تصفیہ کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ اور صحابہ اور امہات مومنین کو اتنا پر زور اہتمام کرنے کی ضرورت نہ تھی اور پھر اتنا ہی نہیں، مستند ترین علماء اور مورخین نے اس تقریب میں

اس قصیدے کا ذکر فرمایا ہے جو حسّان ثابت انصاری نے اس موقع پر پیش فرمایا تھا اور یہ اشعار جس وقت کہے گئے یہ الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ رافضیوں کی من گھڑت ہے۔ خدارا انصاف فرمائیے کہ صاحبِ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی کا ارشادِ گرامی کون بہتر سمجھتا۔ حسّان بن ثابت انصاری جس سے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب تھے یا کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال بعد آپ؟

— آپ یہ تصوّر فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے مواجہہ میں حسان بن ثابت لفظ کی غلط تعبیر کرتے اور آپؐ بجائے اصلاح اور تنبیہ کے تحسین و ستائش کریں۔ ہم اپنے ناظرین کی تفریح طبع کے لئے حسّان کے اشعار اور ان کا ترجمہ پیش کرتے ہیں ؎

ینادیھم یوم الغدیر نبیھم
بخُمٍّ واسمع بالرّسول منادیا

غدیر کے دن ان کے نبی نے غدیر خم میں ان کو آواز دی پس سنو رسُول کی آواز سُنو

قال فمن مولاکم وولیکم
فقالوا ولم یبدوا ھناک لقایا

رسُول خدا نے سوال کیا: تمہارا مولیٰ اور ولی کون ہے تو سب نے جواب دیا اور کوئی غلطی نہیں کی

الهك مولانا وانت ولينا

ولن تجدن فينا لك اليوم عاصيا

آپ کا خدا ہمارا مولا ہے اور آپ ہمارے ولی ہیں۔ آج

آپ ہم کو ہرگز عاصی نہ پائیں گے

فقال له قم یا علی فاننی

رضیتك من بعدی اماما وهادیا

پس آپ نے حضرت علی سے کہا، اے علی اُٹھو! یقیناً میں اس

بات سے راضی ہوں کہ تم میرے بعد امام اور ہادی ہو۔

فمن کنت مولاه فهذا ولیه

فکونوا له انصار صدق موالیا

پس جس کا میں مولا ہوں اس کے ولی یہ بھی ہیں۔ اور تم لوگ

اس کے سچے ناصر اور سچے ماننے والے ہو۔

هناك دعا اللهم وال ولیه

وکن للذی عادیٰ علیا معادیا

اس موقع پر آپ نے دعا کی کہ اے اللہ! اس کے چاہنے والوں

کو پسند کر اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ

جب حسان اپنا قصیدہ پیش کر چکتے ہیں، جس کے چند اشعار

اوپر نقل کیے گئے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں

ٹوکتے ہیں اور نہ لفظ مولا کے ترجمے کی اصلاح فرماتے ہیں، بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ :

لاتزال یاحسان مویداً بروح القدس مانصرتنا بلسانک ؕ

"اے حسّان ! جب تک تم اپنی زبان سے ہماری نصرت کرتے رہوگے تب تک رُوح القدس تمہاری تائید کرتے رہیں گے۔"

خواص الامہ میں سبط ابن جوزی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی کے صاحبزادے قیس بن سعد بن عبادہ کے اشعار بھی اس معنی میں نقل کیے ہیں۔ یہ سارے کے سارے تازہ ترقرائن ایک طرف اور یمن کے دو سال پہلے کی بھولی بسری بات ایک طرف۔ ارشاد ہو کہ کون سا قرینہ قوی ہے ـــ؟ بلاخوفِ تردید عرض کرتا ہوں کہ اگر متوازن اور ناجانب دار شخص کو فیصلہ کرنا پڑے اور وہ اپنے اسلاف کی بے بضاعتی اور ناداری کے باعث خاص طرح کی عینک لگانے پر مجبور نہ ہو تو اس نتیجے کے علاوہ کسی اور نتیجے پر پہونچ سکتا ہی نہیں جس پر مرحوم علامہ شاہ علی حسن جائسی پہونچے ؎

عبث در معنیٔ من کنت مولاہ می روی ہر سو
علیؑ مولا بہ ایں معنیٰ کہ پیغمبر بوُد مولا

ہم اپنے معروضات کی تصدیق پر آپ کو آمادہ بھی نہیں کر سکتے۔

ان مہمات حقائق میں جو کہیں سے اختلافی نہ تھے ان میں کعبۃ اللہ میں حضرت علی کی ولادت کا واقعہ ہے نہ اس پر با سواد علماء اسلام نے کبھی شک کیا اور نہ حکیم بن حزام کے کسی اور پرستار نے اس کے لئے بطور شرف خاص پیش کیا۔ یہ ہمارے مولانا کی طباعی ہے کہ انھوں نے ایسے غیر اختلافی مشہور اور مسلم الثبوت واقعے کو کچھ اور نہیں تو کم از کم اختلافی تو بنا ہی دیا۔ منصب کا غصب ہونا اہل بیت کی فضیلت ہے لیکن جائداد و مناصب کا غصب ایک الگ چیز ہے۔ کم سے کم اس سے دُنیا تو بنتی ہے لیکن غصب فضائل کی جو تاریخ مولانا علی میاں صاحب لکھ رہے ہیں وہ تو دین و دُنیا میں کہیں کام آنے والی نہیں۔ مولانا کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

> "حاکم نے حکیم بن حزام کے حالات میں لکھا ہے
> یہ تواتر سے ثابت ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہٗ خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے اور حکیم بن حزام بھی خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔" [۱]

اس ارشاد کا پیش نظر کتاب کے فاضل مصنف نے بڑی گیرائی اور گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور بہت سی کتابوں کے حوالے سے

---

[۱] المرتضیٰ ص ۴۹

حضرتِ مصنّف اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں جہاں کے باشندے شاہ صاحب تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی سلسلۂ قرابت بھی ہو، اس لئے ہم حضرت کو اس قصیدے کا ایک مصرع اور یاد دلاتے ہیں:

منم سنی ولیکن از تعصّب الاماں گویم

اصحاب کی وفاداری

جناب ندوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"آپؐ نے جن لوگوں کو اپنی آغوش تربیت میں پالا تھا ان کی وفاداری پر آپ کو مکمل اطمینان ہو چکا تھا جنھوں نے آپ کے زیر سایہ آپ کی براہ راست صحبت بابرکت میں رہ کر تعلیماتِ دینی کو اخذ کیا تھا وہ اس پر خود ہی عامل و کاربند تھے اور دوسروں کو بھی کاربند رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے"۔ [1]

یقیناً جو اصحاب باوفا براہ راست صحبت بابرکت میں رہ کر تعلیمات دین اخذ کر چکے تھے وہ عامل بھی تھے اور دوسروں کو دیندار بنانے کا جذبہ بھی رکھتے تھے مگر جو آغوش تربیت میں بھی نہ تھے اور مستقل یا براہ راست صحبت بابرکت سے فیض یاب بھی نہ ہوئے تھے کیا حضور ان سے مطمئن تھے؟ بہت مؤدبانہ سوال ہے کہ سورہ منافقین کی شان نزول کیا ہے؟ اگر ارشاد گرامی یہی ہے کہ وہ قریش کے

[1] المرتضیٰ ص۸۹

کافروں یا مدینہ کے یہودیوں سے متعلق ہے تو کیا اسے کسی اور مفسّر نے بھی لکھا ہے۔ اور اگر انھیں حضرات سے متعلق تھا جن کو فیضِ تربیت اور مصاحبت بابرکت کا شرف حاصل ہوا تو پھر کیا رسولؐ اس سورہ مُبارکہ کے نزول کے بعد بھی ان کی وفاداری پر مکمل اطمینان رکھتے تھے اور پھر سوال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اطمینان کا نہیں ہے۔ جناب مولانا ندوی صاحب اور ان کے امثال نے جو سیرت کی بات کی ہے اسے نظر میں رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارک یا ارشادِ مُبارک سے کچھ بھی منسوب کر دینے کی کامل آزادی ہے۔ لیکن خود خداوندِ عالم کے ان احکام اور ارشادات کا کیا ہوگا۔؟

مثال کے طور پر اگر سب ٹھیک ٹھاک تھا، سب بڑے وفادار تھے، سب کے سب کی وفاداریاں اور صلاحیت پرکھ کر پیغمبر ختمی مرتبت طمانیتِ کاملہ حاصل کر چکے تھے تو یہ بیچ راہ سے سورۂ برأت کی تبلیغ کی ممانعت اور معزولی کیوں؟

اور ــــ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو لاکھوں یار و اصحاب کے گھیرے میں تھے، تو اعلان غدیر کے تعلق سے وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاس کی یقین دہانی کس وجہ سے تھی۔ سازشوں اور سازشیوں کا بلاشبہ وجود تھا اور پیغمبر خوب پہچانتے تھے۔ لیکن

اگر کبھی بہ تقاضائے عصمت و رسالت اپنی ذمّہ داری پر کوئی بات مناسب نہ سمجھتے تھے تو اس کا ذمّہ دار وحیِ الٰہی نہیں تھا۔ جیسا کہ حضورؐ نے سورۂ براءت ہی میں فرمایا: "میں نے کچھ نہیں کہا ہے بلکہ وہی ہوا ہے جو جبرئیلؑ آکر کہہ گئے تھے۔" اور اس حد تک فیضانِ صحبت و تربیت نہ سہی جس حد تک جناب ندوی صاحب وسعت دے رہے ہیں۔ لیکن اتنا تو ساتھ رہتے رہتے سمجھ ہی گئے تھے کہ اس سوال پر مجبور ہوئے کہ ــــ "میرے بارے میں کچھ آیا تو نہیں!!"

کیا کیا عرض کیا جائے۔ کیا عقبہ کی گھاٹیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کا ناقہ خود بخود بھڑکا تھا اور بجلی کی چمک نے چہرے نہیں پہچنوا دیئے تھے؟ اور کیا قدرت کاملہ نے ان کی شناخت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ حذیفہ کو نہیں کرادی تھی۔ اور کیا زندگی بھر اس کی جستجو کچھ مصاحبوں کو نہیں رہی کہ اس فہرست میں میرا نام تو نہیں۔؟!

اور کیا کیا جائے علّامہ ذہبی میزان الاعتدال میں تو یہاں تک فرما گئے ہیں کہ ایک صاحب نے اپنی منافقت کا اعتراف بھی فرمالیا تھا:ــ "واللہ انا من المنافقین"

کیا دمِ واپسیں "قوموا عنّی" کا مخاطب پیغمبرؐ نے صحابیوں

کے علاوہ کسی اور کو بنایا تھا۔ یہ حادثہ تو ایسا تھا کہ ابن عباس ابنِ عمِّ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تاحیات جب بھی یاد کرتے روتے اور فرماتے کہ ہائے ہائے رسُول کو وصیت نہ لکھنے دی۔ ارے یہ کتنی بڑی مصیبت ہے اور تمام مصیبتوں کی جڑ بھی ہے۔

بادل نخواستہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ اگر بالفرض اپنی تربیت سے مستفیض اور صحبتِ بابرکت سے مستفید لوگوں پر جناب ندوی صاحب کے بیان کے مطابق پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اعتماد و اعتبار بھی ہو تو کیا جیش اسامہ سے تخلف کے بعد بھی اس کے باقی رہ جانے کا امکان ہے؟ جیش اسامہ کا قضیہ تاریخ اسلام کا معروف قضیہ ہے اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا ہی یاد دلانا ہے کہ جب یاروں نے دیکھا کہ حضُور بیمار ہیں اور اسامہ کی سرکردگی میں لشکر مرتب فرماکر بھیج رہے ہیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کو اس میں شامل نہیں کر رہے ہیں تو انھیں مستقبل کی کشتی ڈانواڈول نظر آنے لگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تخلف کرنے والوں پر لعنت بھیجنے کی حد تک گئے لیکن ان کو نہ جانا تھا نہ گئے۔ کون صاحبِ عقل سلیم اسے گوارا کرے گا کہ (معاذاللہ) حضورؐ اتنے ضعیفُ الرّائے تھے کہ سب حرکات وسکنات بھی ملاحظہ فرماتے تھے اور وفاداری اور دیانت داری

کا یقین بھی رکھتے تھے۔ اس جگہ پر مولانا ندوی صاحب کے ائمہ کبار میں سے ایک بڑی بزرگ شخصیت امام غزالی نے یہ نشاندہی کی ہے۔

اجمع الجماهیر علی متن الحدیث عن خطبة الغدیر خم باتفاق الجمع وهو یقول من کنت مولاه فعلی مولاه فقال عمر بخٍ بخٍ لك یا ابا الحسن لقد اصبحت مولای ومولا کل مومنٍ ومومنة هذا تسلیم ورضا تحکم بعد هذا غضب الهوی لحب الریاسة وحمل عمود الخلافة الخ

یعنی: " حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبۂ غدیر کے اس متن پر اتفاق جمہور ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا مولا علی بھی ہے۔ عمر نے اس موقع پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ اے ابوالحسن! آپ تو میرے اور تمام مومنوں کے مولا ہو گئے مبارک ہو، مبارک ہو اس طرح عمر نے علی کی امارۃ تسلیم کرلی۔ بعد میں حکومت کی محبت اور سرداری کے ستونوں، اونچے اونچے پرچموں کی

لہروں، گھوڑوں کی ریل پیل، علاقوں پر قبضہ گیری اور شرب
تعیش نے ان حضرات کو بدمست کر دیا پھر انھوں نے عہد شکنی
کی اور اپنے اقرار کو پسِ پشت ڈال دیا اور اس طرز عمل
سے بہت سستا مال خریدا اور جو خریدا وہ بہت گھٹیا خریدا۔"
اور ایسا نہ تھا تو پھر بخاری شریف میں یہ روایتیں کیوں آگئیں اس پر
بھی تو غور فرما لیجئے:

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: یرد علی الحوض یوم القیامۃ رھبط من اصحابی فیحلئون عن الحوض فاقول یارب اصحابی فیقول انک لاعلم لک بما احدثوا بعدک انھم ارتدوا علی ادبارھم القھقری [1]

"ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حوض کوثر پر میرے کچھ صحابی لائے جائیں گے پھر وہ حوض سے ہٹا دیے جائیں گے تو میں کہوں گا اے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں، تو

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۷۴

کہا جائے گا آپ کو نہیں معلوم آپ کے بعد انھوں نے کیا کارنامے انجام دیئے۔ یہ سب مرتد ہو گئے تھے اور (دین سے) الٹے پیروں واپس ہو گئے تھے۔"

وفاتِ رسولؐ

اس موضوعِ غم سے فاضل مُصنّف کس خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں آپ ملاحظہ فرمائیں۔ ہم ایک بار پھر متوجہ کر دیں کہ ذکر وفاتِ رسُولؐ کا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"آپ پر کوئی نوحہ کناں نہ ہوا کیوں کہ آپ نے اپنی آخری زندگی میں نوحہ کرنے سے سختی سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ آپ کا ارشاد تھا کہ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا ان کے اس عمل سے پرہیز کیا جائے"۔ ؎

حضرت مصنف نے یہ استخراج کہاں سے فرمایا، عرض نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ماخذ مدرک میں نہیں ہے۔ جناب مصنّف کے ہم مسلک ایک پیش رو مُلا حسین واعظ کاشفی اپنی کتاب میں اس حادثہ کا ذکر یوں فرماتے

؎ المرتضیٰ ص ۹۲

ہیں کہ :

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے یہ فرمایا کہ اپنے فرزندوں کو لاؤ۔ جناب سیّدہؑ حسنین علیہما السلام کو خدمت میں لے گئیں، دونوں صاحبزادے تسلیم کر کے اپنے جدِ امجد کے پہلو میں بیٹھ گئے اور آنحضرت کو تکلیفِ مرض میں دیکھ کر ایسا روئے کہ دیکھنے والے بھی رونے لگے۔ حسنؑ نے اپنا منہ رسول اللہؐ کے منہ پر اور حسینؑ نے اپنا سر آنحضرتؐ کے سینے پر رکھ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنکھیں کھول دیں اور نواسوں کو بہ نظرِ شفقت و الفت دیکھا، ان کی تعظیم و محبّت کے باب میں سب کو وصیت فرمائی اور ایک روایت میں تو یہ بھی ہے کہ

حسنین علیہما السّلام کے رونے سے در دولت پر حاضر اصحاب ایسا روئے کہ ان کی آوازِ گریہ سُن کر خود آنحضرت بھی رو دیئے۔ پھر فرمایا: میرے برادرِ عزیز علیؑ کو بلاؤ۔ حضرت آئے اور جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرہانے بیٹھ گئے۔ آنحضرت نے اپنا سر بستر سے اٹھایا تو حضرت علی نے آپ کے پہلو میں آکر سرِ مُبارک اپنے بازو پر رکھ لیا۔ آنحضرت نے فرمایا: اے علی! کلابی یہودی

سے میں نے تجہیز جیش اُسامہ کے لئے اس قدر قرض لیا ہے
خبردار اس کے ادا کرنے سے غافل نہ رہنا اور اے علی
تم وہ ہو جو سب سے پہلے میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوگے اور
میرے بعد تم پر بہت صدمے پہونچیں گے تم انھیں بطریق
صبر و شکیبائی برداشت کرنا اور جب یہ دیکھنا کہ لوگوں نے دنیا
اختیار کرلی ہے تب بھی تم آخرت کو اختیار کیے رہنا۔

اس مصنف نے نیز صاحب مدارج النبوۃ نے رحلت رسول اکرم صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کو یوں بیان کیا ہے:

"جب رسُولِ اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتقال
فرمایا تو جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ندبہ وآہ و زاری کرنے
لگیں اور پھر نوحہ کناں ہوئیں کہ آپ نے حق کا بلاوا قبول کرلیا
ہائے بابا آپ جنّت الفردوس کو سدھار گئے۔ ہائے بابا اب
حکم خدا لے کر جبرئیل کس کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔؟
خدایا! میری رُوح کو حضرت کے پاس پہونچادے اور مجھے
اپنے رسول کے نزدیک کردے اور مجھے ان کی شفاعت
اور ان کے ثواب سے محروم نہ فرما۔"

اتنا ہی نہیں محدّث دہلوی کی "ماثبت بالسنۃ" میں بیان ہوا ہے کہ
جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا ندوی صاحب کے اس بیت عنکبوت کے تار و پود بکھیرے ہیں صرف یہ ہی نہیں کہ حضرت کی ولادت کا اثبات حضرات اہلِ سنّت والجماعت کے مستند مدارک کے حوالے سے کیا ہے بلکہ حکیم بن حزام کی ولادت کے بارے میں جو اکلوتی روایت مولانا نے ڈھونڈھ نکالی ہے اس کا رد بھی پُر زور طریقے سے کیا گیا ہے مصنّف نے اپنی ژرف نگاہی سے اس کا سراغ لگالیا ہے کہ حکیم بن حزام کی ولادت کی روایت کا خود زمانۂ ولادت کیا ہے۔ یہاں اس بحث کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیں۔

"اس روایت کا سرا ابوالفضل حسن بن یعقوب سے شروع ہوتا ہے وہ ابو احمد بن عبدالوہاب سے نقل کرتا ہے وہ علی بن غنام عامری سے نقل کرتا ہے۔ اس سلسلۂ روایت میں ابو احمد بن عبدالوہاب کے علاوہ کوئی نہیں جو معروف ہو، سب کے سب مجہول ہیں نہ صرف مجہول الحال بلکہ مجہول العین ہیں۔ سب تو نکلے مجہول الحال اب بچے ابو احمد بن عبدالوہاب تو ذرا دیکھئے ان کے بارے میں علماء درایت کا نظریہ کیا ہے۔

ان کے لئے ابنِ حجر کا تقریب میں یہ کہنا ہے کہ اصول ستہّ میں سے امام نسائی کے سوا کسی نے ان سے

کی قبر مبارک سے تھوڑی سی مٹی لے کر استشمام فرمایا اور پھر یہ شعر پڑھا:

ماذا علی من شمّ تربۃ احمد
ان لا یشم مدی الزمان غوالیا

"جو کوئی رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کی خاک سونگھے گا وہ تمام عمر کوئی خوشبو سونگھنا پسند نہ کرے گا۔"

اب آیئے متواتر بیانات کے بعد، جو سب جناب مصنّف کے ہم مذہب حضرات کے ہیں، اس ارشاد کو بے بنیاد کے علاوہ اور کیا سمجھا جائے کہ کوئی نوحہ کناں نہیں ہوا۔!!!

نوحہ کو بہ شدّت منع کرنے کا جو آپ نے ذکر کیا ہے اسے کامل ابنِ اثیر سے بہ تحریف معنوی حاصل کیا گیا ہے۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ

لعن اللہ الذین اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد

یعنی: "خدا کی لعنت ہو ان لوگوں پر جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا"!

اس میں نوحہ کا ذکر کہاں ہے۔ سختی اور نرمی کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا اور کیا مساجد کا ترجمہ سجدہ گاہ کرنا درست ہے؟ یا یہ لفظ استعمال کر کے کسی خاص سمت میں اشارہ فرما رہے ہیں؟ کیا مصنف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ سجدہ گاہ استعمال کرتے تھے! یہاں ضرورت تو اس کی تھی کہ آپ دادِ تحقیق دیتے اور یہ وضاحت فرماتے کہ یہود و نصاریٰ

نے کب اور کس انداز میں سجدہ گاہ بنائی۔ کس کس کی قبریں تھیں جو سجدہ گاہ بنائی گئیں۔ ظاہر ہے کہ حکمِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تھا کہ قبریں مسجد نہ بنائی جائیں یعنی ان کی پوجا و پرستش نہ کی جائے۔ لیکن آپ کو تو تحریف کی کتنی ہی ریکیک منزل سے گزرنا پڑے لیکن یہ کہ نیر بارانی ہوتی رہے۔ قابلِ داد تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ارشاد عمومی کے مشابہ کو مشبہ بہ کے حکم میں داخل کر کے گمراہ اور ملعون ثابت کرنے کے لئے یہود و نصاریٰ سے مختص کر دیا گیا ورنہ قبریں تو بیت المقدس اور خانہ کعبہ میں بھی ہیں اور مسجد نبوی میں بھی ہیں اور جناب مصنّف خود وہاں سجدہ کر آئے ہیں۔ لیکن یہ لعنت سجدہ گاہ یا سجدہ کرنے والوں پر نہیں ہے، غیر خدا کی پرستش کی جگہ بنانے والوں پر ہے۔ اور تو اور خود مسجد نبوی کے رقبہ کو بڑھا کر قبر پیغمبر کو مسجد کے اندر لے لیا گیا۔ اس کے لیے کیا فرماتے ہیں ؟

شیعوں کی سجدہ گاہ اکثر بے جا اور نا فہمانہ تنقید و تعریض کا ہدف بنتی رہتی ہے۔ سیدھے سیدھے کچھ کہتے لیکن کچھ اور ثابت کرنے کا تو حوصلہ نہیں۔ اس لیے چکر کاٹ کر اور پھیرے لگا کر حملہ کیا جاتا ہے جبکہ بات لے دے کے اتنی ہے کہ کیا کوئی قوم بتوں پر کبھی سجدہ کرتی ہے؟ کیا جس چیز پر سجدہ کیا جائے اسے بت مان لیا جائے؟ تو پھر ہر فرش اور ہر چٹائی پر جہاں سجدہ کیا گیا ہو، وہ بت ہو جائے گی

ویسے تو بہت سے مسلمان مٹی پر سجدہ کرتے ہیں البتہ شیعہ ایک متبرک مٹی پر سجدے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس میں پرستش کا پہلو کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ آپ ہی کے سوچنے اور فرمانے کی بات ہے۔

پھر بھی ہم جناب مولانا کے شکر گزار ہیں کہ جس حد تک ان کے حامی جاتے ہیں اس حد تک مولانا نہیں گئے۔ کیوں کہ شیعوں کو رسوا کرنے کے لئے ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ساتھ بت رکھتے ہیں اور قبر حسینی کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ذرا اپنے یہاں کی معتبر روایات میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم بھی ملاحظہ فرمائیے: ———

کنز العمال میں روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ " سجدہ کے لیے بہترین جگہ مٹی ہے یا جو چیز زمین سے اُگے"۔[۱]

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مٹی پر سجدہ کرتے دیکھا۔ حتیٰ کہ مٹی کے ذرات حضرت کی پیشانی پر دکھائی دے رہے تھے۔

صحیح بخاری میں ام المومنین میمونہ سے مروی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خمرے پر نماز پڑھتے تھے۔

۱؎ صحیح بخاری حصہ اول ص ۱۰۴

جامع ترمذی میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خمرہ پر نماز پڑھتے تھے۔ [۱]

وحید اللغات میں مولوی وحید الزماں خاں تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت ام سلمہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ مسجد سے خمرہ لے آؤ"۔ لفظ خمرہ کا معنی کھجور کے پتوں سے بنایا ہوا ایسا چھوٹا سا ٹکڑا جس پر پیشانی سجدہ کرتے وقت ٹکائی جا سکے۔

ابن اثیر نے جامع الاصول میں لکھا ہے کہ خمرہ وہ سجدہ گاہ ہے جس پر ہمارے وقت کے شیعہ سجدہ کرتے ہیں۔

اس کے بعد وحید الزماں خاں لکھتے ہیں کہ "اس روایت کی رو سے سجدہ گاہ رکھنا سنّت ہے اور جو لوگ اسے منع کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور میں اس سُنّت پر عمل کرنے کی غرض سے کھجور کے پنکھے پر سجدہ کرتا ہوں"۔

شیعوں کے موحد اور مومن ہونے کا اقرار کسی کو ہو یا نہ ہو، یہ معاملہ عبد و معبود کے درمیان کا ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ شیعہ سجدہ صرف اپنے خالق کو کرتے ہیں اور اسے وحدہٗ لاشریک جانتے ہیں اور کسی کو اس کا شریک نہیں قرار دیتے۔ نہ امام کو نہ رسُول کو، نہ خلیفہ کو، نہ صحابہ کو۔

---

[۱] صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۱۴، کنز العمال ج ۲ ص ۱۲، جامع ترمذی ص ۴۶

اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے کہ سجدہ پاک مٹی پر کیا جائے اور پاک مٹی پر سجدہ کو یقینی بنانے کے لئے وہ نہ صرف پاک و پاکیزہ بلکہ مقدس و متبرک مٹی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہم تو عبادت اور سجدہ کو بہتر سے بہتر انداز میں ادا کرنے کے لئے مٹی رکھتے ہیں، کچھ ستم ظریف تو ایسے بھی مل جائیں گے جو عبادت کے لئے پاک مٹی لے کر چلنے کو منع کرتے ہیں مگر استنجا کے لئے ڈھیلے ساتھ رکھنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اب یہ اپنے اپنے معیار فکر کی بات ہے۔

اجازت ہو تو ایک دو لفظوں میں خاکِ کربلا کی اہمیت کے ذیل میں، جو خود رسول مقبول کے عہد مبارک سے مرکز توجہ ہے' ان کتابوں کا حوالہ دے دیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے' یہ ہیں —
جلال الدین سیوطی کی خصائص الکبریٰ! اس طرح ابو نعیم اصفہانی اور بیہقی کی کتابوں میں متعدد روایتیں نقل ہوئی ہیں اور دیگر امہات المومنین کے علاوہ خود جناب عائشہ سے مروی ہیں۔

۴

باب چہارم

- ایک انتہائی فیصلہ کن گھڑی
- حضرت ابوبکر کی بیعت ایک حادثہ !!
- فخرالدین رازی کیا کہتے ہیں
- حضرت علیؑ مرتضیٰ کی بیعت
- خلافت کی پہلی شرط
- امامتِ نماز
- خلافت کی دوسری شرط
- حاکم مستدرک میں کیا کہتے ہیں ؟!
- خلافت کی تیسری شرط
- صُلح حُدیبیہ
- خلافت کی چوتھی شرط
- مالک بن نویرہ
- خلافت کی پانچویں شرط
- البدایہ والنہایہ کی روایت
- خلافت کی چھٹی شرط
- انبیاء کی دُعا
- ابراھیمؑ کے خلیفہ

ایک انتہائی فیصلہ کن گھڑی!

" عرب نئے نئے اسلام لائے تھے ان کو اپنی قدیم قبائلی زندگی میں اتحاد و یگانگت کے ساتھ کام کرنے کی اور کسی نظام کے پابند ہو کر زندگی گزارنے کی عادت نہیں تھی" ۔ لے

پھر دنیا کے عظیم مذاہب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ :۔

" وہ مذاہب آپ آغاز تاریخ ہی میں بے راہ روی (انحراف) اور دین کے اصول میں تغیر و تبدیلی (تحریف) کا شکار۔ اور اندرونی سازشوں اور مخالفتوں کے اثر سے نیم جاں اور بے روح بن چکے تھے "

پھر اس کی علت بھی بیان فرماتے ہیں کہ :۔

" اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ان مذاہب کے اوّلین

لے المرتضیٰ ص۹۲

پیشواؤں اور ذمہ داروں کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہی ان کی قائم مقامی اور ترجمانی ان اشخاص کے حصّے میں آئی جو ان مذاہب وادیان کے مقاصد وتعلیمات کے فہم میں وہ گہرائی نہیں رکھتے تھے یا ان کے بارے میں وہ عزم واخلاص ان میں نہیں پایا جاتا تھا، جو پیغمبروں اور داعیانِ ادیان کے نائبینِ اولین کے لیے ضروری ہے۔ ان کے اندر ان ادیان اور ان کی اصلیت باقی رکھنے کے لئے اس درجہ کی غیرت وحمیت اور فکرمندی بھی نہیں تھی جس کی اس مرحلہ پر ضرورت ہوتی ہے، وہ دنیا طلبی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔" [1]

جناب ندوی صاحب نے یقیناً اپنے مقصود کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بڑا گہرا غوطہ لگایا ہے اور ایک حد تک مطابق واقعہ بھی ہے۔ لیکن اس طالب علم کے لئے قدم قدم پر سوالیہ نشان ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان عظیم مذاہب میں اسلام بھی شامل ہے یا وہ جناب مصنّف کی نظر میں کورا ہے، آخر اس کا ذکر کیوں نہیں۔ تان تو یہاں پر ٹوٹتی ہے کہ یہودیت بہت جلد اس دام تحریف وتزویر میں گرفتار ہو گئی اور حضرت سیدنا عیسیٰ کی مفارقت

---

[1] المرتضیٰ ص ۹۴

کے بعد جلد ہی نصرانیت کو بھی اس سازش اور خطرے سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن شومئی قسمت یہ ہے کہ تاریخ نے جو امانت ہمارے لئے چھوڑی ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رخصت ہوتے ہی دنیا طلبی کے اس سے بدتر مناظر سامنے موجود ہیں اور منا امیر و منکم امیر کی احتجاجی صدائیں آج تک فضائے تاریخ میں گونج رہی ہیں۔

اس محل پر اس نزاع میں الجھے بغیر کہ مرحوم جسٹس امیر علی کا مسلک کیا تھا، ہم ان کی کتاب "اسپرٹ آف اسلام" سے وہ لفظیں پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے صورت حال کی عکاسی کی ہے:

"افسوس! کہ وہ محبت اور برادرانہ اُلفت بتلانے والا مذہب بھی جھگڑوں اور مخالفت سے نہ بچ سکا۔ وہ مذہب جو ایسے پُرآشوب زمانے میں امن و امان اور صلح قائم رکھنے والا پیدا ہوا تھا، اپنے غصّے اور طمع دُنیاوی سے آپ ہی پارہ پارہ ہوگیا۔ ہم دین عیسوی پر ابھی آنسو بہارہے تھے جو کامل نہ تھا اور زمانہ گزرتے ہی اس میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اسلام کی خرابیاں جنھیں ہم آئندہ بیان کریں گے۔ ———

"حکومتِ دُنیاوی کی لالچ، لوگوں کی نفسانیت کی بنا

روایت نہیں کی ہے اور ان کا شمار رجال کے طبقہ حادی عشر میں کیا جاتا ہے اس سلسلے میں ابن حجر آگے کہتے ہیں کہ عاشر تک وہ لوگ ہیں جنھوں نے تبع تابعین سے علم حاصل کیا اور حادی عشر وہ لوگ ہیں جنھوں نے تبع تابعین کی صُورت تک نہیں دیکھی۔

اب رہ گئے علی بن غنام عامری، اول تو ان کا ذکر کسی معتبر و معقول کتاب میں نظر آتا ہی نہیں اور اگر حسُنِ ظن کے تقاضے سے ان کو ثقہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی یہ حادی عشر ہی کی صف میں آئیں گے۔ بھلا کون ہے۔ جو ان کی روایت ایک ایسے واقعہ کے متعلق تسلیم کرے گا۔ جو بعثت سے بھی پہلے پیش آیا تھا۔"

مصنّف کے حقیقت جو قلم نے اسی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ مولانا ندوی صاحب کی فن کاری کو عُریاں کرنے کے لئے یہ بھی ڈھونڈ نکالا ہے کہ خود مولانا موصوف نے جس حاکم سے یہ خبر لی ہے اس نے خود اس روایت کے بارے میں اپنا کیا نظریہ پیش کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ اس آخری بات میں مصنف کو وہم ہوا ہے ورنہ اخبار متواترہ یہ ہیں کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، کی ولادت فاطمہ بنتِ اسد کے بطن سے داخلِ خانۂ کعبہ ہوئی۔

پر پیدا ہوئی، جن کے مزاج میں نیکی و بھلائی کی تربیت نہ تھی"۔ [1]

حصولِ حکومت میں سبقت کس نے کی؟ مہاجر یا انصار نے؟ اس بحث سے اگر صرفِ نظر کر بھی لیا جائے پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ اگر مہاجر ایسا کر رہے تھے تو انصار اس میں شریک کیوں ہوئے اور اگر پہل انصار نے کی تھی تو مہاجر کیوں آگے آئے؟ اس آپسی رسّہ کشی سے کچھ اور واضح ہو یا نہ ہو، یہ تو بہر حال ماننا ہی پڑے گا کہ دونوں کی ایک ہی آرزو تھی!! اور ہر ایک جلد از جلد حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

آپ صفحہ ۱۳۰ پر تحریر فرماتے ہیں کہ: "حضرت ابوبکر کی بیعت کوئی اتفاقی بات نہ تھی"۔ جبکہ آپ کے خلیفۂ دوم حضرت عمر کا کہنا ہے کہ "حضرت ابوبکر کی بیعت ہنگامی حادثہ تھی"!

چنانچہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی صاحب 'تحفہ اثنا عشریہ'، تک اس تعجیل کے قائل ہیں اور 'کنز العمال' میں علی متقی ہندی نے بھی وہ بات نقل کی ہے کہ: "کاش اس دن میں نے اپنی گردن میں یہ جوا نہ ڈالا ہوتا"۔

ورنہ ثقیفہ میں جس وقت مہاجر و انصار حصولِ اقتدار کی جنگ میں الجھے ہوئے تھے اس وقت بنی ہاشم وہاں موجود نہ تھے۔ وہ سب

---

[1] اسپرٹ آف اسلام ص ۲۹۴

رسول کریمؐ کے غسل و کفن میں مشغول تھے۔ وہاں پہلے تو حضرت عمر کا نام نامی پیش ہوا خلافت کے لیۓ۔ مگر حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کے ہاتھوں پر بیعت کر کے سب کو انھیں کی بیعت پر مجبور کر دیا۔ اس کا تو موقع ہی نہ آیا کہ سب مل کر کسی کا نام پیش کرتے اور پھر اس کی بیعت کی جاتی۔ اور اس طرح سعد کی اپنی کوشش ناکام ہو گئی اور نتیجتہً ان کو زدو کوب بھی کیا گیا۔

اصحاب کرام جب اہم ضرورت کی طرف متوجہ ہوۓ کیا وہ "ضرورت" یک بیک سامنے آ گئی تھی؟ اس ضرورت کی خبر خود آنحضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو نہ تھی اور حضرت ختمی مرتبت اس کی طرف متوجہ نہ تھے؟ یا معاذ اللہ ان کو خبر ہی نہ تھی کہ حالات کیا کروٹ لینے والے ہیں!

اگر سیرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور احادیث رسولؐ میں دیکھا جاۓ تو "لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِی" کے ذریعہ گمراہی اور سر گردانی سے بچانے کی کوشش ہی تھی۔

حدیثِ قرطاس میں بھی یہی مسئلہ تھا کہ کوئی ایسی تحریر سامنے آ جاۓ جس کے ذریعہ بعد کے حالات میں اسلام ٹکڑے ٹکڑے نہ ہونے پاۓ۔ لیکن حدیثِ ثقلین اور حدیثِ قرطاس کو مان لینے کے بعد بھی یہ سوچنا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بعد کے حالات

کا کچھ اندازہ نہ تھا، حقائق سے منھ موڑنے کے مترادف ہے۔ ویسے ان تمام باتوں کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ پر رہ جاتا ہے کہ دفنِ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تاخیر کیوں ہوئی؟ جس کی بنا پر مولانا روم یہ کہنے پر مجبور ہوئے ؎

چوں صحابہ حبِّ دُنیا داشتند
مصطفٰےؐ را بے کفن بگذاشتند

کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دفن میں عجلت کا حُکم نہیں دیا تھا؟ یا رسول کی آنکھ بند ہوتے ہی تمام احکامِ شریعت رخصت ہو گئے تھے اور ان کی جگہ بس "نظامِ حکومت" کارفرما ہو گیا تھا؟ اور کیا رسُول مقبول کی تدفین کے وقت وہی طریقے مناسب و ضروری تھے۔ جو سلاطین و امراء کے جنازوں میں نظر آتے ہیں کہ پہلے "جانشین" طے ہو جائے پھر "اعلان" اور دفن و کفن ہو!

اور اگر خوف اس بات کا تھا کہ "نومسلم" آپس میں لڑ جائیں گے تو یہ خیال خود پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں نہ کیا؟ اس ضرورت کا ادراک اگر صحابہ کرام کر سکتے تھے اور اس سے اس نتیجے پر پہونچے کہ یہ مسئلہ دفن رسولؐ سے بھی زیادہ اہمیت رکھنے والا ہے تو خود رسول اللہ نے اس اہمیت کو کیوں نہ درک کیا؟

یقیناً رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر ان تمام

معاملات پر تھی اور نو مسلموں کے دلوں میں طمع دُنیا کس حد تک کار فرما تھی اس کا بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بخوبی اندازہ تھا اور اس لیے حج آخر سے لے کر روزِ آخر تک بار بار مختلف انداز سے اس مسئلے کی طرف متوجہ کرتے رہے۔

خطبۂ حج میں واضح کیا۔ غدیر میں متوجہ کیا، وقتِ آخر قرطاس طلب کیا اور ہر موقع پر قرآن اور اہلِ بیت کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتے رہے اور ان کی ناراضگی سے خوف دلاتے رہے:

من اذانی فی اھل بیتی فقد اذی اللہ

"جو میرے اہلِ بیت کو اذیت دیکر مجھے ستائے گا اس نے (گویا) خداوند عالم کو اذیت دی۔"

والّذی نفسی بیدہٖ لا یبغض اھلبیت احد الا ادخلہ اللہ النّار[1]

"جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم میرے اہلِ بیت سے جو کوئی بغض رکھے گا اسے اللہ تعالیٰ جہنم میں ڈال دے گا۔"

یہ احادیث اہلِ بیت علیہم السّلام کی منزلت کے علاوہ یہ بھی تو واضح

---

[1] صواعق محرقہ، صحیح ترمذی

کر رہی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کو بعد کے حالات کا پورا پورا اندازہ تھا اور انہیں احادیث اور اس وقت کے حالات کا تجزیہ کر کے ابوالفداء نے یہ اعتراف کیا کہ بعد وفاتِ رسولؐ بہت سے عرب مرتد ہو گئے۔ اور صحیح بخاری کی یہ روایت بھی دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ:

ان اناساً بین اصحابه صلی الله علیه و آله وسلم یوخذبهم ذات الشمال فیقول اصحابي اصحابي! فقال انهم لم یزالوا مرتدین علی اعقابهم منه فارقتهم ۱؎

ترجمہ: "رسولؐ کے بعض اصحاب کو جہنم کی طرف لے جایا جائیگا تو آپؐ فرمائینگے کہ یہ میرے اصحاب ہیں میرے اصحاب تو جواب آئے گا کہ آپ سے مفارقت کے بعد یہ مرتد ہو گئے تھے۔"

یہ کیا ماجرا ہے۔ ویسے تاریخی واقعات بھی اس کے شاہد ہیں کہ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الموت میں شدّت آجانے کے بعد جو متواتر حادثات ہو رہے تھے وہ یہ واضح طور سے بتا رہے ہیں کہ آپ کے کسی حکم کی تعمیل آپ کے منشار کے مطابق نہیں کی جا رہی تھی۔ اکثر اصحاب اپنے خیالات و جذبات کے تحت کام کر رہے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ ہر فرد اطاعت و فرمانبرداری کے بجائے اپنی "قوتِ اجتہاد" سے کام لیتا نظر آ رہا تھا اور جیسے جیسے رسولِ کریم کی رخصت کا وقت قریب آتا گیا خود غرضی اور خواہشات نفسانی بڑھتی گئیں۔ امام

۱؎ صحیح بخاری ج ۵ ص ۱۱۳

فخرالدین رازی فرماتے ہیں :

عن ام المومنین عائشة قالت، لما حضر رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم الموت قال ادعوا لی حبیبی فدعوت له ابابکر فنظر الیه ثم وضع راسه فقال ادعولی حبیبی فدعوت له عمر فنظر الیه ثم وضع راسه فقال ادعوا لی حبیبی فقلتُ ویلکم ادعوا له علی بن ابی طالب فوالله مایرید غیره فلما راه اخرجه الثوب الذی کان علیه ثم ادخله فیه [1]

" ام المومنین حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ جب جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کا وقت قریب آیا تو فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ۔ میں نے حضرت ابوبکر کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئے حضرت نے ان کو دیکھا اور پھر سر (تکیہ پر) رکھ لیا اور کہا میرے حبیب کو بلاؤ۔ میں نے حضرت عمر کو بلوالیا۔ جب حضرت نے ان کو دیکھا تو پھر سر (تکیہ) پر رکھ لیا اور کہا میرے

[1] بحوالہ ارجح المطالب ج ۲ ص ۳۳۴ ، ریاض النضرہ ص ۱۸۰

حبیب کو بلاؤ۔ تب میں نے لوگوں سے کہا تم پر افسوس ہے
تم ان کے لئے علی کو بلاؤ۔ یہ علی کے علاوہ کسی اور بلانا نہیں
چاہتے! اور جب علی کو دیکھا تو اس چادر کو ہٹایا جو اپنے اوپر
ڈالے ہوئے تھے اور علی کو اس میں لے لیا"۔

فخر الدین رازی کی یہ تحریر جو ام المومنین سے منسوب ہے اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کو سننے کے باوجود عمل کے وقت اپنے اپنے طریقوں سے بات پوری کی جا رہی تھی۔ اور اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود ندوی صاحب اس وقت کے لیے لکھنے پر مجبور ہوئے کہ "دنیا طلبی میں کسی سے پیچھے نہ تھے"۔

ندوی صاحب خود فرماتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے جو مشکل صورت حال سامنے آگئی تھی اور جس پیچیدہ مسئلے سے یہ نوخیز و نوعمر امت دوچار تھی ...... اس صورت حال پر قابو پانے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ ایسا خلیفہ منتخب کر لیا جائے جس میں ایسی خصوصیات ہوں جن کے ذریعہ (اللہ تعالیٰ کی توفیق و ارزانی کی بدولت) وہ دین کو تحریف سے بچا لے جائے اور امت کو اس جادہ مستقیم سے منحرف نہ ہونے دے جس پر رسول اللہ نے اس کو

چھوڑا ہے"۔ ۱؎

حضور والا! یہ "مشکل صورتِ حال" اور پیچیدہ مسئلہ" نوخیز و نو عمر امّت" کو کیوں پیش آیا؟ صرف اس لئے ناکہ امّت نے حکمِ رسولؐ کی خلاف ورزی کی۔ اس پیچیدہ مسئلے کے حل کے لئے ہی تو کہہ رہے تھے "مجھے کاغذ اور قلم دوات دے دو کہ ایسا کتبہ لکھ دوں جس کی وجہ سے تم لوگ میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو" ۲؎

اس کے علاوہ دعوتِ ذوالعشیرہ اعلانِ نبوت سے لے کر غدیر خم تک اور غدیر سے وفات تک ہر موقع پر علی ابن ابی طالبؑ کی طرف متوجہ کیا:

ھٰذا اخی و وصیی وخلیفتی فیکم فاسمعوا له و اطیعوا فقام القوم یضحکون و یقولون لابی طالب قد امرك ان تسمع لابنك و تطیع ۳؎

ترجمہ: "یہ میرا بھائی، میرا وصی، میرا خلیفہ ہے تمھارے درمیان! اس کی باتوں کو سنو اور اسکی اطاعت کرو۔ تو قوم ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور ابوطالب سے کہنے لگی یہ تم کو حکم دے رہے ہیں تمھارے بیٹے کے بارے میں اور اس کی اطاعت کے لئے"

۱؎ المرتضیٰ صہ ۹۸ ۲؎ ایضاً صہ ۱۲۲ ۳؎ تاریخ ابن جریر طبری ج ۲ صہ ۶۲

انت اخی و وصیی و خلیفتی من بعدی
و قاضی دینی [1]

ترجمہ: "تم میرے بھائی ہو، میرے وصی، میرے خلیفہ میرے بعد ہو اور میرے قرض کو ادا کرنے والے ہو"۔

عن سلمان انه قال یا رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم من وصیّك؟ قال یا سلمان من وصی اخی موسیٰ؟ قال یوشع بن نون قال فان وصیی و وارثی یقضی دینی و ینجز موعدی علی بن ابی طالب [2]

ترجمہ: سلمان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کا وصی کون ہے؟ تو پیغمبر نے فرمایا: اے سلمان میرے بھائی حضرت موسیٰ کا وصی کون تھا؟ میں نے کہا یوشع بن نون۔ تو آپ نے فرمایا: میرا وصی اور میرا وارث میرا قرض ادا کرنے والا اور میرے وعدے کو پورا کرنے والا، علی ابن ابی طالب ہے"۔

تو پیچیدہ اور مشکل صورت حال کے لئے احکامات تو بہت واضح موجود تھے، پھر بھی مسئلہ اگر پیچیدہ رہا یا فرض کر لیا جائے کہ کوئی اعلان رسولؐ

---

[1] ینابیع المودة ج ۲ ص ۵
[2] الریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۷۸، الھیثمی فی مجمعہ ج ۲ ص ۱۱۳

پہلے سے تنہا ہی نہیں تو پھر تمام اصحاب مِل جُل کر کسی نتیجے تک پہونچتے۔ لیکن تمام اصحاب کے مِلنے کی بات تو جانے دیجئے۔ صحیح بخُاری سے مولانا شبلی نعمانی نے اجماعِ اُمّت کی ایک تصویر کشی کی ہے، مُلاحظہ ہو :

کان من خبرنا حین توفی الله نبیّه ان الانصار خالفونا واجتمعوا باسرهم فی سقیفه بنی ساعده وخالف عنا علی و زبیر و من معهما واجتمع المهاجرون الی ابی بکر

یعنی : "ہماری سرگزشت یہ ہے کہ جب خدا نے پیغمبر کو اٹھالیا تو انصار نے قاطبتہً ہماری مخالفت کی، جب سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور علی و زبیر اور ان کے ساتھیوں نے مخالفت کی اور مہاجرین ابوبکر کے پاس جمع ہوئے"۔

امام مالک نے اس اختلاف کو ذرا اور واضح انداز سے بیان کیا اور یوں نقل کیا کہ :

ان علیًا والزبیر و من کان معهما تخلفوا فی بیت فاطمة بنت رسول الله

یعنی : "بے شک علی اور زبیر اور جو لوگ ان دونوں کے ساتھ تھے، ان

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ حضرت امیر المومنینؑ کی مواخاۃ کا واقعہ بھی تقریباً مسلم الثبوت ہے۔ وہ حضرات اہلِ سنّت جو خلفاء میں ترتیبی فضیلت کے قائل ہیں، وہ بھی عقد مواخاۃ سے انکار نہیں کرتے لیکن مولانا ندوی صاحب کو تو کوئی شرف حضرت امیر المومنین علیہ السّلام کے لئے خاص رہنے ہی نہیں دینا تھا، جن جن کے ایک ایک فضیلت کی نفی کرنا یا کم از کم اسے مجروح کر دینا ہی مولانا کا مشن ہے اس لیے ابن سعد اور ابن کثیر سے اس روایت کو نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین اور سہیل بن حنیف کے درمیان بھائی چارہ قائم کرایا۔ لیکن ان کثیر روایات کا جائزہ نہیں لیا جن میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کی مواخاۃ خود اپنی ذات سے قائم کی۔ اور اس کے بعد یہ سرسری تبصرہ کر کے آگے بڑھ گئے ہیں کہ:

"اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں، جن میں سے چند کی اسناد ضعیف ہیں اور بعض احادیث کے متن میں بھی کمزوری ہے۔" [1]

الامام کے فاضل مصنف نے مولانا کے اس بیان کی بھی کمزوری کا

---

[1] المرتضیٰ ص ۶۳

سب نے کنارہ کشی اختیار کی اور بیت فاطمہ میں بیٹھ رہے۔"

تاریخ طبری نے بھی اسے یوں بتایا:—

و تخلف علی والزبیر واخترط الزبیر سیفه
وقال لا اغمده حتی یبایع علی

"اور حضرت علی وزبیر نے علاحدگی اختیار کی اور زبیر نے تلوار کھینچ لی اور کہا جب تک علی کے ہاتھ پر بیعت نہ کی جائے گی میں تلوار کو نیام میں نہ رکھوں گا۔" [۱]

ان روایتوں سے کوئی کچھ بھی نتیجہ نکالے لیکن سب کے سامنے یہ تو واضح ہی ہوجاتا ہے کہ اختلافات تھے اور اجماعی طور سے کسی کا انتخاب نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر ندوی صاحب نے اس موقع پر چھ شرائط تحریر فرمائے ہیں۔ خدا جانے یہ چھ شرائط جن کے تحت کسی کی خلافت طے کی گئی، کہاں سے اخذ کیے گئے قرآن سے؟ کسی حکم پیغمبر سے؟ اصحاب رسول کے بیانات سے؟ یا سقیفہ بنی ساعدہ میں کسی مقرر کی تقریر سے؟ جبکہ انتخاب کے وقت تو آپ کی مذکورہ شرائط پر کسی نے توجہ بھی نہ دی بلکہ جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا کہ "حضرت عمر اس پیچیدہ

---

[۱] الفاروق ص۵۵

نفسیاتی بات کو سمجھ گئے تھے لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع کیا۔" [1]

"چنانچہ حضرت عمر سقیفہ بنی ساعدہ میں مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہوئے اور حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کی دعوت دی" [2]

گویا آپ کی چھ شرطوں میں سے کسی شرط کے تحت نہ تو سب نے مل کر انتخاب کیا نہ ہی ان شرائط کو بنیاد بنا کر بیعت کی دعوت دی بلکہ صرف یہ کہا کہ اللہ نے آپ سب کو ایک ایسے شخص کی قیادت پر جمع کیا ہے جو ہم سب میں بہتر ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا رفیق کار اور یارِ غار رہ چکا ہے (ثانی اثنین اذھما فی الغار) لہٰذا آپ سب کھڑے ہو جائیں اور ان کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ یعنی تمام حاضرین میں سے ایک فرد اپنی صوابدید پر، یا جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا (اپنی بالغ نظری اور خداداد ذہانت سے) معاملے کو طے کر رہا تھا اور سب سے مطالبہ بیعت بھی۔ اور جیسا کہ تحریر کیا جا چکا کہ اس وقت تین گروہ تھے۔ اور خود حضرت عمر کا کہنا ہے، کہ علیؑ، زبیر اور ان کے ساتھیوں نے اختلاف کیا بلکہ اس وقت تو یہ لوگ اس جگہ پر موجود بھی نہ تھے اور فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ فیصلہ

---

[1] المرتضیٰ ص ١٢٨
[2] ۔ [3] المرتضیٰ ص ١٢٩

کیوں ہوا یہ تو جانے دیجئے لیکن آپ کی شرائط کو اس میں کوئی دخل نہ تھا جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا، اس وقت صرف اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے لئے انھوں نے (حضرت عمر) خلیفہ کے انتخاب میں تاخیر کو روا نہیں رکھا۔

تو بات یہ سامنے آئی کہ تمام لوگوں نے تو انتخاب کیا نہیں صرف ایک شخص نے "اپنی بالغ نظری اور خداداد ذہانت" سے خود ہی فیصلہ کر لیا اور دوسروں کو اپنے فیصلے پر مجبور بھی کیا۔ ابنِ جریر طبری اسی بات کو یوں لکھتے ہیں :—

"پس حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ ہاتھ پھیلاؤ میں تمھاری بیعت کروں۔ حضرت ابوبکر بولے کہ نہیں تم اپنا ہاتھ پھیلاؤ، کیوں کہ تم مجھ سے ہر طرح قوی تر ہو۔ کچھ دیر یہی کش مکش رہی بالآخر حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کا ہاتھ پھیلا کر ان کی بیعت کی، اور کہا تم اپنی قوت کے ساتھ میری قوت کو بھی شامل سمجھو"۔ [1]

ابنِ اثیر نے تاریخ کامل میں اس طرح نقل کیا ہے کہ حضرت عمر اور دوسرے اشخاص نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی مگر کل انصار یا بعض انصار

---

[1] تاریخ طبری

نے کہا: "ہم علی کے سوا کسی کی بیعت نہ کریں گے"۔

اور مروج الذہب میں مسعودی نے اتمام حجّت کی یہ بات بھی تحریر کر دی کہ جب سقیفہ میں حضرت ابوبکر کی بیعت کی گئی تو حضرت علی نے جا کر حضرت ابوبکر سے کہا تھا کہ تم نے ہمارے امور کو تباہ کیا اور ہم سے کچھ نہ پوچھا اور نہ ہمارے حق کی رعایت و نگہداشت کی۔ حضرت ابوبکر بولے کہ تمھاری شکایت بجا ہے۔ مگر میں نے فتنے کے خوف سے ایسا کیا۔

الاستیعاب میں ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ جب ابوبکر کی بیعت کی گئی تو حضرت علی نے انکی بیعت نہیں کی اور خانہ نشینی اختیار کی۔

تاریخ ابوالفدا میں ملتا ہے کہ بنی ہاشم کی ایک جماعت نیز زبیر، مقداد، سلمان فارسی، ابوذر، عمّار یاسر اور براء بن عاذب وغیرہم علی کی طرف رہے۔

تاریخ خمیس نے بھی حضرت علی مرتضیٰ اور بنی ہاشم کے حضرت ابوبکر کی بیعت سے انکار کا ذکر کیا ہے اور خود جناب ندوی صاحب نے اس کا اقرار کر لیا کہ چھ ماہ تک سہی، مگر حضرت علی نے ابوبکر کی بیعت نہیں کی۔

ان تمام شہادتوں سے یہ اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ اصحاب کا ایک بڑا گروہ ایک فرد کی بالغ نظری اور فیصلے کا تابع نہیں رہا بلکہ کھل کر

انکار کیا اور اسی بنا پر روضۃ الاحباب میں ملتا ہے کہ جب حضرت ابوبکر کو بیعت کی مہم سے فرصت ملی تو انھوں نے بعض مہاجر اور انصار کے ذریعہ حضرت علی کو بلوایا۔

حضرت علیؑ نے آکر پوچھا: مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے ؟

حضرت عمر بولے: اس لیے بلوایا گیا ہے کہ جس طرح سب نے بیعت کی ہے تم بھی بیعت کر لو۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: جس بات کو تم نے انصار پر حجّت قرار دیکر منصبِ خلافت حاصل کیا ہے اسی کو میں تم پر حجّت قرار دیتا ہوں۔ سچ بتاؤ جو شخص رسالت مآب سے قریب تر ہے وہ کون ہے ؟

حضرت عمر بولے: جب تک تم بیعت نہ کر لوگے میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: پہلے تم میری بات کا جواب دو اس کے بعد بیعت کے لیے کہو۔

اس موقع پر ابو عبیدہ بول اٹھے۔ اے ابوالحسن! سبقتِ اسلامی اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرابتِ قریبہ کا شرف اس کی وجہ سے بے شک تم ہی حکومت و خلافت کے مستحق ہو۔ مگر صحابہ نے ابوبکر پر اتفاق کر لیا ہے مناسب ہے کہ تم بھی انھیں کا ساتھ دو۔

حضرت علی نے فرمایا: اے ابوعبیدہ! خدا نے جو موہبت

خاندانِ رسالت کو عطا کی ہے کیا تم چاہتے ہو کہ اس کو دوسری جگہ منتقل کر دو۔ دیکھو موہبت وحی اور مورد امر و نہی، منبع فضل و علم، معدن عقل و حلم ہم ہیں۔

یہ سُن کر بشیر بن سعد نے کہا۔ اے ابوالحسن! تمھارے گھر میں بیٹھے رہنے کے باعث یہ گمان ہوا کہ شاید تم کو امر خلافت سے کنارہ کشی منظور ہے۔

حضرت علی نے بشیر کو یوں جواب دیا:

"اے بشیر! کیا تم اس بات کو صحیح سمجھتے ہو کہ میں رسُول اللہ کے قالب انور اور جسد اطہر کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ کر طلب خلافت و حکومت کے لیے منازعت و مخاصمت میں مشغول ہوتا۔؟"

اسد الغابہ نے اس جواب کو یوں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے یوں فرمایا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ تم بمنزلت کعبہ ہو، جس کے پاس سب آتے ہیں، وہ کسی کے پاس نہیں جاتا۔ پس اگر قوم کے لوگ تمھارے پاس حاضر ہو کر بیعت کریں تو قبول کرو، ورنہ ان کے پاس نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ وہ خود تمھارے پاس آئیں۔

یاعلی انت بمنزلۃ الکعبۃ[۱]

اس گفتگو کے نتائج کو اگر روضۃ الاحباب میں دیکھا جائے تو وہاں

۱۔ اسد الغابہ

یوں ملتا ہے کہ جب یہ باتیں حضرت ابوبکر نے سماعت فرمائیں اور دیکھا کہ ہر بات ہزاروں باتوں کے مقابل استوار ہے تو نہایت نرمی سے ارشاد فرمایا کہ:

"اے ابوالحسن! میں نے خیال کیا تھا کہ تم کو میری بیعت میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ اگر میں جانتا کہ تم میری بیعت سے تخلف کروگے تو میں اس کو ہرگز قبول نہ کرتا۔ اب لوگ چوں کہ میری بیعت کر چکے ہیں، اگر چاہو تو تم میرے خیال کے مطابق ان سے تم بھی موافقت کرو اور اگر اس بات میں تم کو کچھ توقف اور تامل ہے تو کوئی الزام بھی نہیں"

پس حضرت علیؑ وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر چلے آئے۔

اس پوری داستان میں کہیں ندوی صاحب کے ان چھ نکات کا تذکرہ نہیں ملا۔ گویا انتخاب پہلے کر لیا گیا اور شرائط و خصوصیات کا خاکہ اب پیش کیا جا رہا ہے۔ ویسے اگر ندوی صاحب کے شرائط و نکات کو ضروری اور خلافت کی مسند پر پہونچنے کی شرط واقعی مان لیا جائے تو پھر آیئے ایک ایک شرط کو پرکھ لیا جائے۔

خلافت کی پہلی شرط

جناب ندوی صاحب خلافت کی پہلی شرط یوں تحریر فرماتے ہیں:

(۱) "اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اسلام لانے کے بعد زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکمل اعتماد کا اس کو شرف حاصل رہا ہو، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس کی شہادت دی ہو اور دین کے متعدد اہم ارکان اور اہم ترین ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لئے اس کو اپنا قائم مقام بنایا ہو، اور ایسے خطرات سے پُر مواقع پر اس کو اپنے ساتھ لیا ہو جس کے لئے صرف اسی کو انتخاب کیا جاتا ہے جس پر پورا اعتماد اور مکمل بھروسہ ہو۔"[۱]

خلافت کی یہ شرط جیسے ندوی صاحب پیش فرما رہے ہیں، یہ قرآن و حدیث میں تو ڈھونڈھے نہ ملے گی۔ یہ تو انتخاب کے بعد کی ایک کوشش

---

[۱] المرتضیٰ صہ ۹۹-۹۸

ہے کہ کسی معین فرد کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی خصوصیتیں اس شان سے بیان کی جائیں کہ وہ باوجود نااہل ہونے کے، اہل مانا جانے لگے ہم اپنے لفظوں میں عرض کریں تو ندوی صاحب کے ارشاد کا محصّل اس طرح ہوتا:

(۱) حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام زندگی ان صاحب پر اعتمادِ کامل رہا ہو۔

(۲) اہم ترین ذمّہ داریوں کی بجا آوری کے لئے انھیں اپنا قائم مقام بنایا ہو۔

(۳) پرُخطر اور نازک مواقع پر ان کو اپنے ساتھ رکھا ہو۔

اب ہم ان نتائج کا جائزہ لیتے ہیں۔ زندگی بھر سرورِ کائنات کا اعتماد وہ بھی بدرجہ کمال حاصل رہا۔ اگر آپ کو اس کی تشخیص فرمانا ہے تو دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر دمِ آخر تک کے ایک ایک لمحے پر نظر دوڑایئے اور کسی مخصوص عینک کے پابند نہ ہو کر کھُلی آنکھوں سے دیکھئے تو صاف نظر آجائے گا کہ اس شرط کا حامل اور زندگی بھر کا معتمد وہ شخص ہے جس سے وصیتیں کی جاتی ہیں۔ کسی غزوہ میں روانگی کے وقت نائب بھی بنایا جاتا ہے۔ اگر یہ شکوہ کیا گیا کہ حضور مجھے چھوڑے جا رہے ہیں تو ارشاد ہوا کہ کیا تمھیں یہ بات پسند نہیں "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ"۔ یعنی تمھیں مجھ سے وہی

نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی [1]

وقتِ آخر انسان اسی کو یاد کرتا ہے، بُلاتا ہے جس پر سب سے زیادہ بھروسہ ہو۔ وصیتیں بھی ایسے ہی معتمد کامل سے کی جاتی ہیں۔ کہیں یہ ذکر آچکا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ۔ تو حبیب کے اجمال کا فائدہ اٹھا کر کون کون صاحب کس کس طرح بُلائے گئے۔ لیکن حضورؐ کو تو اپنے معتمد کی تلاش تھی۔ ان بُلائے جانے والوں کی طرف نظر توجہ بھی نہ ڈالی اور جب علی آگئے تو انھیں سے وصیت کی اور انھیں کے زانو پر سر رکھ کر حیاتِ مستعار کی آخری سانس لی۔

آپ نے پیغمبر اکرم کے اظہار اعتماد کے لئے ایک آیت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اگر بالفرض اس آیت سے فضیلت کا کوئی پہلو نکلتا بھی ہے تو جناب ابن عباس سے مروی اس قول کا کیا جواب ہے کہ:

نزل فی علی اکثر من ثلاثة مأة آیةً فی مدحه

یعنی: "علی کی مدح میں تین سو سے زیادہ آیتیں نازل ہوئیں" [2]

کہاں رحمتِ یزدانی کا وہ بہاؤ اور آیات قرآنی کی وہ بہتات اور کہاں آپ کی تلاش بسیار کے بعد ایک آیت! جس کا آپ نے

---

[1] صواعق محرقہ [2] ینابیع المودة ص۱۲٦

پردہ فاش کیا ہے اور اس سلسلے میں بڑی مدلّل بحث کرکے خاتمۂ کلام میں بانی مذہب وہابی محمد بن عبدالوہاب کا یہ حوالہ پیش کیا ہے اور ان کا یہ اقتباس نقل کیا ہے کہ:

"پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین کے درمیان بعض کی بعض سے مواخاۃ دوسری مرتبہ (پھر) قائم کی اور اس مرتبہ بھی علیؑ کو اپنا بھائی بنایا۔"

یہ نمونے تو اس لئے پیش کیے گئے کہ آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ کتاب مواد کے اعتبار سے کتنی وقیع ہے اور کس درجہ موضوع کا حق ادا کرتی ہے لیکن جن حضرات کو الامام کے مطالعہ کا شرف و ثواب ملے گا وہ اس بات کو بھی محسوس کریں گے کہ پیش کش کا انداز بھی بہت دل کش ہے اور زبان سہل ہوتے ہوئے بھی عامیانہ نہیں ہے۔ نثر دل کش اور جملوں کی ساخت قابلِ قدر ہے۔

یہ کتاب محض جوابی کتاب نہیں ہے۔ اس کی افادیت کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ مباحث کی تشریح اس انداز سے کی گئی ہے کہ جو چیزیں بطور اصطلاح ندوی صاحب کی کتاب میں آگئی تھیں ان کی تشریح بھی ہوگئی ہے جیسے معتزلہ اور تشیّع کا امتیاز یا مواخاۃ کیا ہے اور اس کا وقوع کب کب ہوا اور ایسی ہی بے شمار چیزیں جو عقائد حقہ سمجھنے میں کافی مفید ہو سکتی ہیں۔

اپنی کتاب میں صـ۱۰۴ پر ذکر فرمایا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ وہ مدح ہے جس میں کوئی دوسرا پاس و شریک نہیں!!

لیکن حضور! ذرا نظر بصیرت سے ملاحظہ فرمائیں کہ اگر مدح ہے اس آیت میں تو کس کی ہے۔ یہ سورہ توبہ کی آیت ہے:

الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ
الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار
اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ
معنا فانزل اللہ سکینتہ علیہ وایدہ
بجنودٍ لم تروھا وجعل کلمۃ الذین
کفروا السفلیٰ ط و کلمۃ اللہ ھی العلیاط
وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ (۴۰)

ہم آپ کے پاس خاطر سے آیت کا ترجمہ خود نہیں کریں گے بلکہ وہ ترجمہ پیش کریں گے جو شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب نے کیا ہے:

"اگر تم رسول کی مدد نہ بھی کرو (تو کچھ پروا کی بات نہیں) اللہ اس کا مددگار ہے اور اس نے اپنے رسول کی مدد اس وقت بھی کی تھی جب کافروں نے اس کو ایسا بے سروسامان گھر سے) نکال باہر کیا کہ صرف دو آدمی

اور وہ پیغمبر ان دو میں کا ایک تھا ، اس وقت یہ دونوں غار (ثور) میں تھے (اور) اس وقت پیغمبر اپنے ساتھی (ابوبکر) کو سمجھا رہے تھے کہ (کچھ) رنج (فکر) نہ کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے ۔ پھر اسلام نے اپنے پیغمبر پر اپنی (طرف سے) تسلی اتاری اور اس کو (فرشتوں کی) ایسی فوجوں سے مدد دی جن کو تم نہیں دیکھ سکے اور کافروں کی بات کو نیچا کر دیا اور (سدا) اللہ ہی کا بول بالا ہے اور اللہ غالب (اور) صاحب تدبیر ہے۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں حضرت ابوبکر کی کون سی فضیلت پنہاں ہے : بات تو صرف اتنی ہے کہ آیت خبردار کرتی ہے کہ جو ساتھ تھا اسے حضرت سمجھا رہے تھے اور درس دے رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے لیکن وہاں صبر کہاں ! کہ آنے والے وقت کی پیش آمد تیاری کرتے ، آہ و زاری ہی میں مصروف ہیں ۔

مناسب محل تو یہ تھا کہ حضرت کی تسلّی و تشفی سے فائدہ اُٹھاتے صبر و تحمل سے کام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دُکھے دل کو کچھ تھوڑی بہت راحت پہونچاتے ۔ لیکن آپ ہیں کہ رو رو کر حضرت کی زحمت کو بڑھائے جا رہے ہیں ! اس کیفیت نے آنحضرت ص کو

یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کہیں یہ آواز غار سے باہر نہ پہونچ جائے اس لئے خاموش رہنے اور تسلّی دینے کی کوشش فرمائی کہ اتنے خوفزدہ کیوں ہو؟ خدا تو ہمارے ساتھ ہے ہی۔ لیکن حیرت بالائے حیرت ہے کہ پیامبر امن واماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تسلی وتشفی کے باوجود اطمینان وسکون کی کیفیت نہ پیدا ہونا تھی نہ ہوئی! یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آیتِ شریفہ میں صراحت ہے کہ "فانزل سکینۃ علیہ" بس اللہ ہی تھا کہ اس نے اپنے پیغمبر پر تسکین اور رحمت نازل فرمائی اور اپنے نظر نہ آنے والے (فرشتوں) کے لشکر کے ذریعہ کمک پہونچائی۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ "علیہما" نہیں ہے کہ اس واحد کو بڑھا کر تثنیہ تک لے جایا جائے اور اس شرف میں معاذاللہ کسی کو ختمی مرتبت کا شریک وسہیم گردانا جائے۔ جب حقیقت عیاں ہو گئی تو حضرت ابوبکر کے لئے فضیلت کیا بچی؟ تقدیر ساتھ دے تو لفظ "صاحب" یعنی ہم نشیں مصاحب کا وصف کلاہ افتخار ہو سکتا تھا لیکن حکمت کاملہ کہیں جامعیت ومعنویت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی اسلیۓ اس کا سد باب پہلے ہی ہو گیا تھا۔ جب واقعۂ جناب یوسف میں آپ کے ساتھ قیدی کافر کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہو چکا ہے۔ (سورۂ یوسف۔ ۳۹)

کیوں کہ صاحب ساتھ رہنے والے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس سے کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔

اور بات یہیں تمام نہیں ہوتی۔ سورۂ کہف میں بھی قال لصاحبہ اور "قال صاحبہ" بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں بھی جن "صاحب" کے لیے استعمال ہوا ہے وہ بھی کافر تھے۔

اب رہ گیا دوسرا شرف کہ اہم تر ذمہ داریوں میں قائم مقام بنایا، تو آیئے اس سے بھی حیات پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی حصّے سے دیکھنا شروع کریں کہ جب اعلان بعثت منظور ہوا تو دعوتِ ذوالعشیرہ کے لیے اہتمام اور بلاوے، دونوں کی ذمہ داریاں حضرت علی علیہ السلام کو سونپی گئیں۔ جب ذوالعشیرہ میں امداد و اعانت کا مثبت جواب بس ایک ہی طرف سے آیا تو اس کی وصایت کا اعلان فرمایا گیا۔ اگر یہ حضرت علی نہ تھے تو کون تھا۔؟ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ چھوڑ رہے ہیں حکمِ ہجرت ہو چکا ہے تو کس کو اپنا بستر دے کر قائم مقام بناتے ہیں۔ گھر کس کو سونپتے ہیں، امانتوں کی واپسی کا فریضہ کس سے متعلق کرتے ہیں، پھر اپنے متعلقین کو لے کر مدینہ پہونچنے کی ذمہ داری کس کو سونپتے ہیں؟ کیا اس کے جواب میں علی علیہ السلام کے سوا آپ کوئی اور نام لیں گے؟

اور پھر اگر جنگ کے لئے تشریف لے گئے تو اپنی وہ فضیلت

عطا فرمائی جس کا ذکر آپ بڑی بیش بندیوں کے بعد کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سورۂ برأت کا اعلان کرنے کے لئے روانہ تو کر دیا مگر جب مرضیٔ الٰہی ہو تب تو! حکمِ الٰہی آگیا کہ اس اہم ذمہ داری کو یا آپ خود سنبھالیں یا آپ کا ایسا معتمد سنبھالے جو آپ ہی جیسا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس تاکیدی و تشریحی ہدایت کے بعد پیغمبر کو اس ذمہ داری سے حضرت ابوبکر کو معزول کرنا پڑا۔ اب کون سا شرف باقی رہا؟ اور یہ واقعہ تو ایسا ہے جس کے ذکر سے آپ اپنے کو باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئے، اور کسی نہ کسی طرح سپردِ قلم و قرطاس کرنا ہی پڑا۔

یہ سورہ سنہ ۹ ھ میں نازل ہوا۔ اس سال امیر حج حضرت ابوبکر کو بنایا گیا تھا لیکن جب سورۂ برأت نازل ہوا تو حضرت علی کو امیر حج بنا کر فوراً بھیجا گیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کی گئی، کہ ابوبکر کے ذریعہ کیوں نہیں بھیجا گیا تو ارشاد فرمایا:

"یہ کام میری طرف سے کوئی ادا نہیں کر سکتا سوا اس کے جو مجھ سے ہو۔"

یہی حکم قدرے تفصیل سے تفسیر دُرِّ منثور سیوطی میں نقل کیا گیا ہے۔ اور سیوطی نے بڑے واضح انداز میں ایک جملے کا اضافہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت علیؑ نے سورۂ برأت لے لیا تو حضرت ابوبکر "فراجع" پلٹ آئے اور بارگاہ رسالت میں اپنے

بارے میں سوال کیا۔ ازالۃ الخفاء میں شاہ ولی اللہ صاحب بھی یہ اقرار کرتے ہیں۔

اب بچتا ہے یہ سوال کہ کیا کبھی نماز کے سلسلے میں کوئی ذمہ داری سونپی گئی تھی تو اس کے لئے مولوی احسان اللہ صاحب عباسی گورکھپوری نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ نماز کی امامت سے کسی کے استحقاق خلافت کی کوشش کرنے والے کو چاہیئے کہ اسامہ بن زید کی خلافت کو مان لے کیوں کہ نماز کی امامت سے بڑا مسئلہ تو اس علم کی علمداری ہے جسے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے سجایا اور سب کو اس پرچم تلے آنے کا حکم دیا۔ اور جس نے اس لشکر سے تخلّف کیا اس پر لعنت فرمائی ——— لیکن یہ جملہ بہر حال تاریخ کا جزو بن گیا ہے لم ینفذ حتی مات رسول اللہ۔

پیغمبر کا حکم عملاً نافذ نہ ہوا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوگیا۔ اب اس بات کو ضرور دیکھ لیا جائے کہ جیش اسامہ میں شرکت سے کوئی مستثنیٰ تھا یا نہیں؟ تو پتہ چلے گا کہ حضرت علی و بنی ہاشم میں سے تمام افراد بلکہ وہ افراد جو دوست دارانِ علی میں شمار ہوتے تھے، ان کے نام نامی بھی اس فہرست میں نہیں ہیں۔ جیسے عمّار، مقداد، ابوذر وغیرہ۔

اس کے برخلاف وہ تمام افراد جن کے مختلف فضائل بتائے جاتے ہیں، سب کے لیے حکم تھا کہ جیش اسامہ میں شرکت کریں اور مرض کی شدّت کے باوجود بار بار پیغمبر تاکید فرما رہے تھے کہ اس لشکر سے ملحق ہو جاؤ، لیکن یہ لوگ اس حکم پر عمل کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ بقول علامہ شہرستانی یہ دوسرا اختلاف تھا جو اصحاب کے درمیان ہوا۔ اور وہ دو گروہ میں منقسم نظر آئے ایک وہ جو حکم پیغمبر کو بہر صورت بجالانے کے لئے تیار تھا۔ اور دوسرا گروہ جو صریحی احکامات کے باوجود ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

امامتِ نماز

امامتِ نماز کو وجہِ ترجیح کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ جب اس دلیل کو پیش کرنے والے یہ مانتے ہیں کہ نماز کی امامت کے لئے عدالت بھی شرط نہیں بلکہ نماز تو یجوز الصلوٰۃ خلف کل برّ و فاجر[۱] یعنی ہر اچھے بُرے کی اقتدا میں نماز ہو سکتی ہے، تو اب نماز کی امامت کرنے سے کوئی فضیلت کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے؟ پھر نماز کی قیادت وہ کرے جو حکم رسُول کی صریحی نافرمانی میں مبتلا ہو۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا

---

[۱] شرح مواقف

کہ جیش اُسامہ میں شامل ہو اور وہ اس صریحی حکم سے سرتابی بھی کرے اور نماز کی امامت بھی کرے ۔ ہاں اہلِ حق کی بات دوسری ہے، وہ نماز کی امامت کرنے والے کو ترجیح اس لیے دیتے ہیں کہ اس کی عدالت کو شرط سمجھتے ہیں اگر وہ اس سے استدلال کرتے تو یہ ان کا حق تھا کیوں کہ وہ ہر کس و ناکس کی اقتداء میں نمازِ جماعت کے جواز کے قائل ہی نہیں ۔ وہاں شرائط معین ہیں اور ان پر پورا اترنے والا ہی نماز کی امامت کا اہل ہے لہٰذا وہ کسی ایسے کی امامت نماز تسلیم ہی نہیں کر سکتا جو حکمِ رسُول سے سرتابی کا مرتکب ہو اور وہ بھی ایسا حکم کہ "جو اس حکم سے سرتابی کرے اس پر لعنت ہو" ـــــ اور صحیح بخاری کی شرح میں ابن حجر مکی بھی تسلیم فرما چکے ہیں :

کان فی الجیش الذی کان علیہ
اسامہ ابوبکر و عمر[1]

لیکن کچھ اصحاب تاکید شدید کے باوجود ایسے وجوہ سے جن سے وہی واقف رہے ہوں گے، جیش اسامہ میں شرکت کا حکم محکم بجا نہیں لا سکے اور مدینہ میں جمع رہے اور بمطابق ارشادِ رسول تخلف کرنے والوں پر لعنت کی زد میں آگئے ۔ اب جناب ندوی صاحب ان کی امامت نماز کو وجہِ فضیلت بنا کر پیش کر رہے ہیں ـــــ لیکن ندوی صاحب کی اس شد و مد

---

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۶۹

کے باوجود انھیں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہا کہ اس فضیلت کو خود حضرت عمر تسلیم نہیں فرماتے تھے جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں کہ "وصیت فرمائی کہ جب تک خلیفہ کا انتخاب نہ ہو جائے تین دنوں تک صہیب رومی نمازوں میں مسلمانوں کی امامت کریں گے"۔ لہ

اور فرمایا (حضرت عمر نے) میں نہیں سمجھتا کہ لوگ عثمان اور علی کے مقابلے میں کسی اور کو ترجیح دیں گے۔ ؎

نہ یہ منصب دستوری کمیٹی کے ارکان کو سونپا گیا نہ خلافت کے لئے منتخب ہونے کے متوقع افراد عثمان اور حضرت علیؑ کے سپرد کیا گیا نہ ہی عشرہ مبشرہ کی کسی فرد کو امامت نماز سونپی گئی بلکہ ایک اور شخص کو منصب دے کر عملاً یہ واضح کر دیا گیا کہ امامت نماز کے شرف کا کوئی تعلق جانشینی سے نہیں ہے۔

پھر ندوی صاحب نے اس ضمن میں ایک اور حقیقت کو بڑی ہوشیاری سے دوسرا رُخ دے دیا ہے، لکھتے ہیں: ـــــــ

"عورتوں کے طبقے کا طرزِ گفتگو وہی ہے جو ان عورتوں کا تھا جن سے حضرت یوسفؑ کو سابقہ پڑا تھا"۔ ؎۳

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا کیا مقصد تھا

لہ ؎ المرتضیٰ صہ ۱۹۸

؎۳ المرتضیٰ صہ ۱۰۵

اس کی تعلیل و توضیح فرماتے ہوئے جناب ندوی صاحب نے حاشیہ آرائی فرمائی ہے کہ :

"تم اس سے ڈر رہی ہو کہ اگر تمہارے والد کی امامت کے زمانے میں میری وفات ہوگئی تو لوگ تمہارے والد کو مطعون کریں گے کہ ان کی نیابت نامبارک تھی۔" لے

جبکہ حقیقتِ حال بالکل برعکس ہے۔ پیغمبر اسلام جب اپنے حبیب کو طلب کر رہے تھے اور ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تاخیر ہوئی اور حضرت علی علیہ السّلام کے بجائے دوسرے افراد کو بلایا گیا تو اس وقت پیغمبر اسلامؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔

اتنا ہی نہیں، اس پیش نمازی کے بارے میں وہ تضاد و اختلاف ہے کہ کوئی بات یقین سے کہی جا سکتی ہی نہیں۔ کسی ایک چیز میں اختلاف ہو تو اسے سمجھا بھی جائے۔ یہاں تو حالت یہ ہے کہ اوقاتِ نماز میں اختلاف، تعداد نماز میں اختلاف، اذان میں اختلاف اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ امامت نماز کون کر رہا ہے اس میں بھی اختلاف، کوئی لکھ رہا ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف لے آئے اور امامت فرمائی۔ کوئی کہتا ہے کہ ابوبکر امام بنے۔ روایات

لے المرتضیٰ ص ۱۰۵

کتاب کی اس خصوصیت کی طرف بھی اشارہ لازمی ہے کہ ہر چند کتاب جوابی ہے پھر بھی دانشمند مصنّف نے ایک بھی موقع ایسا نہیں آنے دیا ہے جس میں مولانا ندوی کے مقتداؤں پر کسی طرح کے طنز و تشنیع کا الزام لگایا جا سکے۔ امید کی جانا چاہیئے کہ اس کتاب کی ویسی ہی قدر کی جائے گی جس کی یہ مستحق ہے۔ انشاءاللہ

سیّد طیّب رضا نقوی
حوزہ علمیہ زینبیہ
دمشق۔ سوریہ

جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ

میں اختلاف کی اس شدت کے باوجود یہ طے کرلیا گیا کہ بس امامت حضرت ابوبکر کر رہے تھے اس لئے منصب خلافت کے بھی لائق تھے

حیرت یہ ہے کہ اس شرف امامت سے جو نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے وہ خود جنابِ عمر کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں کی صحیح میں ہے کہ :۔۔۔۔۔۔۔

قال عمر ان لم استخلف فان رسول الله لم یستخلف و ان استخلف فان ابابکر استخلف فھذا تصریح منه بعدھم استخلاف النبی ۔

"حضرت عمر کا فرمانا ہے کہ اگر میں نے کسی کو اپنے بعد کے لئے جانشین مقرر نہیں کیا تو کیا ہوا۔ رسول اللہ نے بھی تو کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا تھا اور اگر میں مقرر کر جاؤں تو بھی کیا حرج ہے۔ آخر حضرت ابوبکر نے جانشین مقرر کیا تھا اور یہ واضح اعلان ہے کہ پیغمبر نے کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا۔"

تو آپ اگر مان بھی لیں کہ امامت نماز کا موقع کسی مصلحت یا مجبوری سے دے بھی دیا تھا تو اس سے استحقاق خلافت کہاں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن آپ اس کو دیکھتے چلیں۔ قاضی عبدالجبار اپنی کتاب سنن میں رقم طراز ہیں کہ :۔۔۔۔۔۔

ان ابابکر نص علی عمر و ترك تاسی الرّسول لانہ لم یستخلف۔

" حضرت ابوبکر نے حضرت عُمر کے لئے اعلان فرمایا یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاسی کے خلاف ہے اس لئے کہ رسول اللہ نے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا۔"

شاہ ولی اللہ صاحب کا فرمانا ہے :

" جاننا چاہیئے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر نہیں کیا اس لیے حضرت عمر پر حضرت ابوبکر کی مخالفت کا الزام نہیں عاید کیا جاسکتا۔"

اب اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ جب استخلاف ہی ثابت نہیں ہوتا تو پھر پیش نمازی کو حجت بنا کر ضد کرنا کہ اسی بنا پر ابوبکر کی خلافت ثابت ہے، کس قدر مضحکہ خیز بات ہے۔

اب چلئے وہ خطرات دیکھے جائیں جن میں ساتھ رکھنے کا دعویٰ ہے۔ ندوی صاحب نے یہ تحریر نہیں فرمایا کہ سفر ہجرت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کب ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کے برخلاف اکثر حضرات نے اعتراف کیا ہے کہ جب حکم ہجرت نازل ہوا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ تم میرے بستر پر سو جاؤ۔ حضرت علی نے بلا تامل تعمیل حکم کی۔ لیکن کسی اور کو طلب

کر کے پیغمبرِ اسلام نے ساتھ چلنے کی فرمائش کی ہو، یہ تو کسی نے نہیں لکھا ہے۔ حدیہ ہے کہ خود جناب ندوی صاحب نے بھی نہیں لکھا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کو اپنے بستر پر جانشین کر کے مکہ سے باہر نکل رہے تھے اس وقت یہ محسوس فرمایا کہ کوئی تعاقب کر رہا ہے۔ اب پیغمبر کی مصلحت ہو ہی نہیں سکتی کہ آنے والے کو واپس جانے کا موقع دے کر راز فاش ہو جانے کا خطرہ مول لیں۔ اس لئے مدینہ تک ساتھ ہی رکھا۔

اس ساتھ رکھنے سے فضیلت تو کوئی ثابت نہ ہوئی البتہ یہ سوچنے کا محل تو بہر حال ہے کہ پیغمبرؐ اپنے ساتھ لے کر کیوں چلے گئے ـــ ؟ اور ساتھ جانے والا اتنا نڈر بھی نہ تھا بلکہ قرآن کے بموجب ذرا سی آہٹ پر گریہ وزاری شروع ہو گئی اور خداوندِ عالم نے صرف اپنے حبیب پر سکون واطمینان اتارا۔ دشمنوں کو غار سے دُور کر دیا۔

اب اس مختصر مگر مطلب خیز عرضداشت کے بعد ہمیں ان ذمّہ داریوں کا جائزہ لینا ہے جن کا بار کسی نے نہ اٹھایا ہو بلکہ یہ بار برداری صرف حضرت ابو بکر کا خاصہ ہو۔ افسوس ہے کہ اس میدان میں ہماری کوشش بار آور نہ ہوئی اور کوئی ایسی بات نہ ملی جو سرکارِ رسالت میں صرف حضرت ابو بکر کے لئے مختص رہی ہو۔ اس کے برعکس جب ہم ذوالعشیرہ سے لیکر سانحہ وفاتِ رسول تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ انور

پر نظر ڈالتے ہیں تو بار بار ایسے مواقع ملتے ہیں جہاں مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساتھ رکھا اور ایک نہیں بار بار مختلف دینی ذمہ داریوں کا ذمہ دار بنایا۔ ایسے مواقع کئی ہیں جن میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولائے کائنات علیہ السلام کو اپنا قائم مقام کیا ہے۔

اس لئے اگر ہم جناب ندوی صاحب کی شرط اوّل کو دُرست بھی مان لیں تو بھی اس شرط پر ان کے مطلوب سے زیادہ حضرت علی مرتضیٰؑ کھرے اُترتے ہیں اور اگر اس شرطِ خلافت کو مانا جائے تو پھر حضرت علی کے سوا کوئی جانشینی کا مستحق ٹھہرتا ہی نہیں۔

خلافت کی دوسری شرط

جناب ندوی صاحب خلافت کے لئے دوسری شرط و مطالبہ یہ پیش کرتے ہیں کہ:

" اس کی خصوصیت یہ ہو کہ بلاخیز آندھیوں کے وقت جبکہ دین کی رُوح اور اس کی اصلیت کا چراغ جھلملا رہا ہو اور اس کے بعد بجھ جانے کا خطرہ ہو، ایسے سخت طوفان کے عالم میں جب کہ بڑے بڑے دل گرُدے والے ایمان ویقین کے پیکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طویل صحبت اور رفاقت کا شرف رکھنے والے بھی سہم رہے ہوں، یہ شخص پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہا ہو (اس نے اس موقع پر) ثبات واستقامت میں انبیاءِ سابقین کے کردار کا مظاہرہ کیا ہو، جس نے نگاہوں سے پردے اٹھا دیئے ہوں اور صحیح عقیدے اور دین کی اصلیت پر غبار نہ آنے دیا ہو۔" [1]

---

[1] المرتضیٰ ص ۹۹

یہ دوسری شرط بھی پہلی ہی کی طرح خود ساختہ ہے اور اتنی ہی بے حقیقت، نہ اس کا سراغ قرآن سے مل سکتا ہے اور نہ حدیثِ رسول سے۔ لیکن اگر جناب ندوی صاحب اس پر بضد ہی ہیں تو آیئے اس کا بھی جائزہ لے لیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ اصحابِ رسولؐ میں سے کون سی ذات اس شرط پر زیادہ بہتر طریقہ سے پوری اترتی ہو، وہ کون ہے جو اُس وقت جبکہ سب سہم رہے ہوں اور وہ پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہا ہو اور پھر جب اکثر صحابہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور شیطانی آوازہ پیغمبر کے اس دنیا سے گزر جانے کا افسانہ انگیز اعلان کر رہی تھی اور بڑے بڑے دل گردے والے جان کی خیر منا رہے تھے۔ اس موقع کی عکاسی علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ کامل میں یوں فرمائی ہے:

"جب مسلمانوں نے فرار اختیار کیا تو علی نے مشرکین کے علمداروں پر حملہ کر کے ان کو قتل کیا۔ پھر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مشرکین کی ایک جماعت کو دیکھا تو حضرت علی سے فرمایا ان پر حملہ کرو چنانچہ حضرت حملہ آور ہوئے اور ان کو تتر بتر کر دیا۔ پھر حضرت نے مشرکین کی ایک اور جماعت دیکھی پھر حضرت علی سے کہا ان پر حملہ کرو، حضرت علی نے ان پر بھی حملہ کیا۔ بعض

قتل ہوئے اور بقیہ متفرق ہو گئے۔ اس موقع پر جبرئیل آئے اور عرض کی کہ یہ ہے علیؑ کی محبت اور جاں نثاری۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، کیوں نہ ہو علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ جبرئیلؑ نے کہا حضورؐ! میں آپ دونوں سے ہوں۔ اس وقت آواز سنائی دی:۔

"لَافَتیٰ اِلَّا عَلِی لَاسَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار"

مولوی عبدالحق محدّث دہلوی نے بھی اس واقعے کو یوں نقل کیا ہے:۔

"روز احد از گروہ مخالف چناں پیکار شدید واقع شد کہ مسلمانان باہزیمت آوردند و حضرت رسولؐ را تنہا گذاشتند حضرت در غضب آمد و عرق از پیشانی ہمایونش متقاطر گشت دراں حالت نظر کرد علی بن ابی طالب را کہ بر پہلوئے مبارکش استادہ ست فرمود کہ چرا بہ برادران خود ملحق نہ گشتی یعنی فرار نہ کردی؟ علی گفت اکفر بعد الایمان یعنی آیا کافر شوم بعد ایمان بتحقیق کہ مرا بتو اقتدا ست"[1]

ترجمہ: اُحد کے دن دشمنوں سے ایسی زبردست جنگ واقع ہوئی کہ بالآخر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور حضرت پیغمبر کو تنہا

---

[1] مدارج النبوۃ ج ۲، ص ۱۶۷

چھوڑ دیا۔ اس وقت پیغمبر کو غصّہ آیا اور آپؐ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اسی عالم میں آپؐ نے دیکھا کہ علی ابن ابی طالب پہلو میں کھڑے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم دوسروں سے ملحق کیوں نہ ہو گئے یعنی تم نے فرار کیوں نہ کیا؟ تو حضرت علی نے فرمایا، کیا میں ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیتا؟ میں تو صرف آپ کی اقتدا کرتا ہوں۔"

حاکم نے مستدرک میں یہ ذکر کیا ہے: ـــــــــ

عن عائشة قالت قال ابو بکر الصدیق لما جاء الناس علی رسول اللہ یوم احد کنت اول من جاء الی رسول اللہ

یعنی: "حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ابو بکر نے فرمایا کہ جب رسول خدا کو چھوڑ کر سب لوگ چلے گئے تھے تو سب سے پہلے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس واپس آنے والوں میں میں تھا۔"

تاریخ حبیب السیر میں بھی دیکھ لیجئے: ـــــــــ

"نوبت زید بن وھب از عبد اللہ بن مسعود می رسید کہ چنیں شنیدہ ام کہ روز احد بغیر از علی مرتضیٰ و ابو دجّانہ و سھیل بن حنیف رضی اللہ عنہم در خدمت رسول اللہ ہیچ کس نماندہ بود

این خبر مطابق واقع ست یا نہ؟ جواب داد کہ در اوایل حال کہ سپاہ اسلام رو بہ وادیٔ انہزام نہادند بجز مرتضیٰ احدی در نزد مصطفیٰ نماند و بعد از ساعتی عاصم بن ثابت و ابو دجانہ وسہیل بن حنیف وطلحہ بن عبداللہ بمز اولت خیر البشر شتافتند کہ محاربت برمیان بستند دباز پیر سید کہ ابو بکر و عمر کجا بودند؟ گفت ایشاں نیز بگوشۂ رفتہ بودند وچوں حال از عثمان بن عفان استفسار نمود گفت او نیز بطرفے شتافتے و در روز سیوم پیدا شد۔"

یعنی: ایک دفعہ زید بن وھب نے عبداللہ بن مسعود سے پوچھا کہ میں نے ایسا سنا ہے کہ احد کے دن علی مرتضیٰ، ابو دجانہ، سہیل بن حنیف کے علاوہ خدمت پیغمبر اسلام میں کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ خبر مطابق واقعہ ہے یا نہیں؟ تو ابن مسعود نے جواب دیا کہ جب اسلامی لشکر نے وادیِ شکست میں قدم رکھ دیا تو علی مرتضیٰ کے سوا کوئی محمد مصطفیٰ کے پاس نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد عاصم بن ثابت، ابو دجانہ، سہیل بن حنیف اور طلحہ بن عبداللہ حضرت خیر البشر کی خدمت میں آئے اور جنگ میں شریک ہوئے۔ زید نے پھر پوچھا کہ ابو بکر و عمر کہاں تھے؟ تو ابنِ مسعود نے جواب دیا کہ وہ بھی کسی گوشے میں چلے گئے تھے۔

اور جب اس نے عثمان بن عفان کے لیے پوچھا تو جواب دیا کہ ہاں وہ بھی کسی طرف نکل گئے تھے اور تین دن کے بعد دکھائی دیے۔ [1]

یہ تو تھا اُحد کا معرکہ۔ اب ایک نظر احزاب پر بھی ڈال لیجیے۔ جنگِ احزاب میں مُسلمانوں کا لشکر بہت بڑی مُصیبت میں مبتلا تھا۔ اتنا خوف طاری تھا کہ کلیجے منھ کو آرہے تھے اور بچاؤ کی کوئی صُورت نہ تھی۔ خدا کو بھول گئے تھے، ایمان متزلزل ہوگئے تھے، نوبت یہ آگئی تھی کہ خدا و رسُول کی نسبت بدگمانیاں کرنے لگے اور کہنے لگے کہ معاذ اللہ خدا اور رسول نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا اور واپس جانے کے مختلف بہانے بنائے جارہے تھے۔

رسُول اسلام صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لشکر کی حالت دیکھ کر جناب سلمان فارسی کے مشورے سے خندق کھودنے کا حکم فرمایا۔ اُدھر کفّار نے فیصلہ کن لڑائی کا فیصلہ کرلیا اور ایک ہزار کا دستہ لے کر عمرو بن عبدوُد لشکرِ کفّار سے نکلا۔ عمرو بن عبدوُد کی دلیری کی دھاک تمام عرب پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ تن تنہا ہزار آدمیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس کو آتا دیکھ کر بڑے بڑے جوشیلے اور قدآور مسلمان سہم گئے اور

---

[1] حبیب السیر ج ۱ ص ۳۷

حرفِ مُصنّف

المرتضیٰ نامی اپنے مکتوبی شعبدہ کو جناب علی میاں ندوی صاحب نے اس دم خم سے پیش کیا تھا کہ یہ مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ کی مفصل سوانح حیات، خاندانی خصوصیات وہبی کمالات وغیرہ کی مستند کتب تاریخ سے ناقابلِ انکار واقعات و حقائق اور تجزیاتی و تقابلی مطالعے کی روشنی میں ضبطِ تحریر میں آیا ہے۔

کتنی مسرّت کی بات تھی کہ مولا علی مرتضیٰؑ کی سوانح حیات ایک ایسے عالم جلیل کے قلم سے لکھی جائے جس نے ابھی چند سال پہلے "اسلام کی دو متضاد تصویریں" کے آئینے میں خود اپنی ہی متضاد تصویر کا جلوہ دکھایا تھا۔ امید تھی کہ اس کتاب سے وہ گرد و غبار چھٹ جائیگا جو ہمارے اور حضرت کی حقیقی شخصیت کے مابین حائل ہے، لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مطالعے نے یہ بتادیا کہ حضرت مصنّف نے یہ کتاب قندِ مکرّر کے طور پر پیش کی ہے تاکہ مولائے مُتقیانؑ کی حیاتِ طیبہّ کے وہ منوّر و تابناک پہلو جو متعصّب مورخوں اور تذکرہ نگاروں کی کمال جدوجہد کے باوجود

اس کی مبارز طلبی پر مبہوت کھڑے تھے۔ لشکرِ اسلام کی اس کمزوری کو دیکھ کر ابنِ عبدوُد کی جرأت اور بڑھی اور خندق پار کر کے سامنے آگیا لیکن کوئی روکنے والا نظر نہ آیا۔ اس نے محسوس کرلیا کہ میرا رُعب چھاچکا ہے اس لئے اس نے کئی دفعہ آواز دی مگر سب خاموش رہے۔

اس موقع پر محدّث شیرازی لکھتے ہیں:

"یارانِ رسُول اللہ ہم استادہ بودند ہیچ نمی گفتند کانّما علیٰ روسھم الطّیر"۔

یعنی: "رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب صحابی خاموش کھڑے تھے اور ایسے بے حس و حرکت کہ گویا ان کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں کہ حرکت کرتے ہی اڑ جائیں گے"۔

علامہ شبلی بھی سیرۃ النبیؐ میں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ:

"عمرو بن عبدود تنہا ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا لہٰذا اس کا خوف تمام لشکر پر طاری ہوگیا۔" [1]

اس خوفزدہ لشکر کو مزید خوف بھی خود لشکر میں موجود ایک فرد نے دلایا گویا اس کا رجز بزمِ پیغمبر میں پڑھا گیا۔ معارج النبوۃ میں پوری تفصیل یوں موجود ہے کہ کہنے والے نے عمرو بن عبدود کی آواز پر یہ کہا کہ:

"ارے یہ تو عمرو بن عبدود ہے، مجھے اس کی بے نظیر شجاعت

---

[1] سیرۃ النبیؐ

کا خود تجربہ ہے۔ ایک بار سفر میں ڈاکو ہمارے قافلے پر
ٹوٹ پڑے تھے تو تنہا اس شخص نے قزاقوں کی بڑی جماعت
سے مقابلہ کیا تھا اور جب اثنائے جنگ اس کی سپر ٹوٹ گئی
تو ایک اونٹ کے بچے کو اٹھا کر اپنی سپر بنالیا تھا"۔

ایک تو لشکرِ اسلام پر پہلے ہی سے خوف طاری تھا اس "چشم دید" گواہ نے انھیں اور حواس باختہ کر دیا۔ لیکن اس پورے لشکر میں بس ایک فرد نے بار بار ابنِ عبدود کو جواب دینے کے لئے اجازت چاہی اور بالآخر اسی کو اجازت بھی ملی اور اس نے اس فیل صفت دشمنِ اسلام سے لشکرِ اسلام کو بچایا۔ اس بے مثال جرأت اور جہاد فی سبیل اللہ میں پیش قدمی کی بنا پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:——

"برز الایمان کلہ الی الکفر کلہ" [1]

یعنی: "کُلِّ ایمان کُلِّ کفر کے مقابلہ کے لیے نکلا ہے"۔

قال فضل بن روزبھان روی الجمھور ان علیا
لما برز الی عمرو بن عبدود قال النبی
صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم برز الایمان
کلہ الی الکفر کلہ

یعنی: "فضل بن روزبہان نے کہا ہے کہ جمہور نے روایت کی ہے

---

[1] ینابیع المودۃ۔ ارجح المطالب

کہ جب جناب امیر علیہ السّلام عمرو بن عبدود کے مقابلے
میں نکلے تو رسُول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا
کل ایمان کل کفر کے مقابلے میں نکلا ہے"۔

اب ان شہادتوں کے بعد ندوی صاحب غور فرمائیں کہ شرط دوم پر کون پُورا اترتا ہے اور اس شرط کو اگر ماننا ضروری ہے تو اس شرط کا مصداق کون قرار پاتا ہے۔

اس شرط کے ساتھ بے محل نہ ہوگا اگر صلح حُدیبیہ کا ایک منظر دیکھ لیا جائے۔ مولائے کائنات علی مرتضیٰ علیہ السّلام کا جذبہ جاں نثاری شب ہجرت اور ہر جنگ میں واضح و آشکارا ہے۔ لیکن سیرت بن ہشام کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

ثم دعا عمر بن الخطاب لیبعثہ الی مکۃ
فیبلغ عنہ الشریف قریش ماجاء لہ فقال
یا رسول اللہ انی اخاف قریشا علیٰ نفسی
ولیس بمکۃ من بنی عدی بن کعب احد
یمنعنی و قد تعلم قریش عداوتی ایاھا
و غلظتی علیھا ولکنی ادلك علی رجل اعز
بھا منی عثمان بن عفان۔

یعنی: رسُول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت عمر کو بلوایا

تاکہ ان کو اپنا پیغام دے کر قریش کے پاس بھیجیں لیکن حضرت عمر نے عذر کیا اور کہا: "مجھے قریش سے اپنے نفس کو ڈر لگتا ہے اور مکہ میں عدی سے کوئی نہیں ہے جو میری حفاظت کرے اور قریش کو یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے ان سے کتنی عداوت ہے۔ لیکن میں آپ کو ایسے شخص کا پتہ دوں جس کو کفار عزیز رکھتے ہیں اور وہ ہیں عثمان بن عفان۔"

خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم، اور اس پر عذر، وہ بھی صرف اس بنا پر کہ ڈر لگتا ہے، جان کا خوف ہے۔

اب جناب ندوی صاحب اپنی شرط کو ملاحظہ فرمائیں اور اس عمل کو اپنی خود ساختہ شرط پر پرکھیں۔ پھر خود ہی فیصلہ کریں۔ کون پورا اترتا ہے اس شرط پر۔ اور کون اس شرط کی بنا پر ہرگز مستحق نہیں ہو سکتا۔

خلافت کی تیسری شرط

المرتضیٰ میں نبی کی خلافت کے شرائط و مقتضیات میں تیسرا معیار جناب ندوی صاحب یہ قرار دیتے ہیں کہ " اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اسلام کا صحیح ادراک اور اس کی حقیقت اور روح اس کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ، جنگ کی حالت میں، صلح کی صورت میں، خوف و دہشت کی فضا میں، امن و سلامتی کی ساعتوں میں، اتحاد و یگانگت کی حالت میں، تنگی ترشی میں اور فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی میں ہر ہر موقع اور ہر حالت میں اس کے پیشِ نظر ہو"۔ [1]

براہِ کرم یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ماسبق دو شرطوں کے مانند یہ تیسری شرط بھی جناب ندوی صاحب کی اپنی ایجاد ہے کیوں کہ اس شرط کا ذکر بھی انعقاد خلافت کے سلسلے میں سابقین نے نہیں کیا ہے۔ اس وقت تو کچھ اور سوجھی تھی، زبان آگے بڑھی

---

[1] المرتضیٰ صد ۹۹

تو یہ شرط تراشنے میں آسانی ہوگئی۔ اب اسے جناب ندوی صاحب نے ایجاد ہی فرما دیا ہے تو ہمارے لئے اس کے تجزیے سے مفر نہیں۔

آیئے دیکھیں کہ اگر اس شرط کو بھی درست مان لیا جائے تو جناب ندوی صاحب اپنا مدعا ثابت کیسے کرتے ہیں۔ کیوں کہ جن بزرگوار کے منصب کو برحق ثابت کرنے کے لئے اس مقدمہ کی ایجاد کی وہ بیچارے کسی بھی نہج سے اس شرط کی کسوٹی پر کھرے اترنے کے لائق نہیں۔ یہ ایسی چیز نہیں کہ جس کا احساس خود جناب ندوی صاحب کو نہ ہو۔ کیوں کہ اس شرط کے وقت (دیکھیں ص۱۰۱) ندوی صاحب کو کوئی بھولا بسرا، چھوٹا موٹا واقعہ ایسا نہ مل سکا، جس کے بارے میں کہا جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ انجام دیا گیا تھا۔

ہاں وفاتِ رسول کے بعد منصب ہتھیالینے کے بعد یہ بیان خود اس بات کی بالواسطہ شہادت ہے کہ منصب ہتھیاتے وقت یہ شرط پوری نہ تھی۔ اگرچہ اس موقع پر ندوی صاحب نے ایک اور خامی کو بکمال ہوشیاری بدلنے کی سعی لاحاصل کی ہے فرماتے ہیں:

"اس کا اندازہ ان کے ایک جملے سے ہو سکتا ہے
وہ ایک جملہ طویل اور بلیغ خطبے کے برابر بلکہ ایک کتاب

کے برابر ہے "۔ [1]

یعنی جب کوئی بلیغ خطبہ نہ مل سکا اور پوری کی پوری زندگی میں کوئی ایسی چیز ہاتھ نہ لگ سکی جسے کسی طرح معرکہ آرا کہا جا سکے تو اب رائی کا پربت بنایا جا رہا ہے۔ ایک جملہ کو بلیغ و طویل خطبوں کا باب بلکہ ایک ضخیم کتاب کا ہم پایہ ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ہم سوئے ظن سے قدم قدم پر بچنا چاہتے ہیں لیکن پانی نشیب کے علاوہ جائے کہاں ؟ اسلئے عرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ نہج کسی بلاغت کے شاہکار اور ضخیم کتاب کی یکتائی کے اعتراف سے فرار کا مظہر تو نہیں ؟

رہ گئی بات اسلام کے صحیح ادراک اور اس کی حقیقت اور روح سرایت کر جانے کی، تو قرطاس بین کو بھی اس کا اندازہ ہر اس موقع پر ہو جاتا ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی حکم دے رہے ہوں اور اس سے بے جھجک سرتابی کی جا رہی ہو ـــــ اور یہ مواقع اوراقِ تاریخ پر ایک جگہ نہیں بہت سی جگہوں پر بکھرے پڑے ہیں۔ بدر میں جب سب جان و تن کی بازی لگائے ہوئے تھے، اس وقت کون اپنی جان کی فکر میں سرگرداں تھا ؟

اُحد میں جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان جوکھم میں تھی

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۰۸

تو اس وقت اُن کو اپنی جان سب سے زیادہ پیاری نظر آ رہی تھی ۔ !
کیا سمجھا جائے کہ جہاد و شہادت کے درجات سے نا آگاہ تھے ؟
بہر حال یہ سوال کہ شہادت سے فرار کیوں ؟ اب تک جواب کا منتظر رہے گا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ جنگ کی حالت میں صلح کی صُورت میں ۔ یہ طباعی اور ادیبانہ طرز اظہار کے نظر فریب مناظر ہیں ۔ لیکن جناب ندوی صاحب نے اس کے مصداق کی کوئی نشاندہی نہیں کی کہ حالتِ جنگ یا حالتِ صلح میں کب یہ صفت بروئے کار آئی ؟ لیکن اگر کسی حقیقت سے تاریخ ہی ناواقف ہو تو جناب ندوی صاحب کی طباعی کے کتنے ہی جوہروں کو ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ تمام لڑائیوں میں ان حضرات کا طرز عمل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا رہا ہے ۔

اب رہی صلح کی بات تو حدیبیہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ خوف و دہشت کی فضا آپ جانے دیں، درگزر کریں ۔ مصیبت تو یہ ہے کہ امن و سلامتی کی ساعتوں کا بھی کوئی منظر ایسا نہ ملا جسے جناب ندوی صاحب بطور شہادت پیش فرما سکتے ۔ ہمیں تو جتنے مناظر ملے وہاں استقامت نام کی کوئی چیز ان حضرات کے عمل میں نظر نہ آئی ۔ اُحد کے موقع کی ایک روایت جو

جناب عائشہ سے مروی ہے، پہلے پیش خدمت کی جا چکی ہے۔ جنگِ احزاب میں جو حالت تھی وہ کسے معلوم نہیں۔ ہاں امن و سلامتی کی حالت میں زبانی جمع خرچ کا حساب تو بہت ہے لیکن کیا محترم ندوی صاحب اسے اسوۂ رسُول کا درجہ دینا چاہیں گے۔ اگر اسوۂ رسُول کا نمونہ جنگ و صلح کی حالت میں دیکھنا مقصود ہو تو نئے ماخذوں کی تلاش کی زحمت نہ ہوگی وہی کتابیں کافی ہوں گی جن کے حوالے ندوی صاحب بار بار دے رہے ہیں۔ انھیں کی اوراق گردانی کی جائے تو وہ وجہ وجیہہ روز روشن کی طرح نظر آجائے گی جو ہر موقع پر نصرت و مدد کے لیئے ہر طرح سے آمادہ رہا۔ صاحب حبیب السیر نے جنگِ احزاب کا نقشہ پیش کرنے کے بعد ایک موقع پر لکھا ہے:

"پس حضرت شمشیر خود را بوئے داد و زرہ خود را در وے پوشانید و دستار خود را بر سر وے نہاد و در روایت آں کہ عمامہ از برائے وے بست و گفت اللھم اعنہ بار خدایا یاری دہ علی را بر عمرو بن عبدود۔ و در روایتی کہ دست ہائے خود را برداشت بصری آسمان و گفت الٰہی عبیدہ را در روز بدر از من گرفتی و حمزہ را در روز احد از من جدا ساختی و ایں علی ست برادر من و پسر عم من فلا تذرنی فردًا و انت

خیر الوارثین"۔ [1]

یعنی (اجازت جنگ کے بعد) جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی تلوار ان کو یعنی حضرت علیؑ کو دی۔ اپنی زرہ انھیں پہنائی اپنی دستار مبارک ان کے سر پر رکھی۔ یا ایک اور روایت کے مطابق عمامہ ان کے سر پر باندھا اور دُعا فرمائی اللھم اعنہ بارالہا! علی کو عمرو بن عبدود پر فتح عنایت فرما۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور عرض کی کہ خدایا تو نے بدر میں عبیدہ کو لے لیا۔ اُحد میں حمزہ کو مجھ سے جدا کیا۔ اب یہ علی ہے میرا بھائی، میرے چچا کا بیٹا۔ اب مجھے تنہا نہ کرنا اور نہ بے وارث بنانا۔ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

---

[1] حبیب السیر ج ۱ ص ۳۸۸

حال حال تک مسلمانوں اور غیر مسلمین میں آفتابِ نصف النہار کے مانند روشن اور نور بخش ہیں، ان کو بھی شکوک و شبہات کے گہن کے حوالے کر دیا جائے۔

کس طرح عرض کیا جائے کہ حضرت مصنف نے اتنا بھی پاس و لحاظ نہ فرمایا کہ وہ اپنے برادر بزرگ سے کوئی وعدہ کر چکے ہیں اور ایسے واقعات کے بیان کا عہد کیا ہے جن کے انکار کی مجال نہ ہو۔

کتاب کے منظرِ عام پر آتے ہی ضرورت تھی کہ جس علمی تغلب کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اس کے بھید کھول دیئے جائیں۔ اسی لئے ناچیز مصنّف نے ہفت روزہ "عجم" لکھنؤ کے کچھ شماروں میں چند باتوں کا جواب اور حقیقت پر پڑی نقاب کو چاک کرنے کا فریضہ انجام دیا تھا لیکن اس وقت ملکی حالات ایسے نہ تھے کہ اسے مدون کر کے کتابی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا لیکن بہ تاخیر سہی حضرات مومنین کے شدید اصرار پر ان مضامین کو کتابی شکل میں مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے جس کی اشاعت کا بار مجلس علماء و واعظین کے ذمّہ ہے۔

یہ حقیقت خاطر عاطر میں رہنا چاہیئے کہ ہرگز ہرگز یہ مقصود نہیں کہ حضرات اہلِ سنّت والجماعت کے عقائد پر معترضانہ نظر ڈالی جائے یا ان کے عقیدوں میں جو "رجال اسلام" ہیں ان کی

خلافت کی چوتھی شرط

جناب ندوی صاحب کی مجوزہ چوتھی شرط یہ ہے :

" اس کی یہ خصوصیت ہو کہ دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم و دائم رکھنے کی فکر اور اس کی غیرت اس کے اندر اس سے بدرجہا زیادہ ہو جس قدر کسی کو اپنے گھرانا ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کی عزت و حرمت کے بارے میں غیرت ہوتی ہے اور اس راہ میں محبوب سے محبوب شے اور عزیز سے عزیز ہستی کی پاسداری کوئی تادیل و توجیہ کسی طرح کا خوف یا طمع حائل نہ ہو سکتا ہو[1]"

یہ شرط بھی سابقہ شرطوں کی مانند ایسی شرط ہے جس کا ذکر اس جماعت نے نہیں کیا، جس نے خلافت کے سوال کو سقیفہ میں طے کیا تھا۔ اس سے قطع نظر یہ سوال پھر بھی قابلِ غور ہے کہ

---

[1] المرتضیٰ صـ ۱۰۰

ندوی صاحب کے ممدوح (بے استحقاق) کس طرح پورے اُترتے ہیں ؟ کیوں کہ اس شرط اور جناب ندوی صاحب کے موصوف کے درمیان تاریخی حقائق دیوار کی طرح قدم جمائے ہیں۔ جس حمیت و غیرت کا مطالبہ کیا جارہا ہے کیا اس کا اندازہ ہم اس سے لگائیں کہ حضرت بدر میں دُور دُور رہے۔ یہ دُوری اُحد میں فرار سے بدلی۔ آگے بڑھے تو خندق میں ایسا چپ ہوئے کہ محدث شیرازی کو اس کی عکاسی کانّما علیٰ رؤسھم الطیر (گویا سروں پر طائر بیٹھے ہوئے تھے) سے کرنی پڑی۔ اور خیبر کا معرکہ پیش آیا تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔

ہاں! خود ندوی صاحب نے جن واقعات کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان کا تجزیہ بے شک لازمی ہے۔ مانعین زکوٰۃ کا ارتداد اور ان کی سرکوبی کا اہتمام اور اسی بہانے خالد بن ولید کی چیرہ دستی اور پھر مشیر خاص حضرت عمر بن خطاب کے اصرار بلیغ کے باوصف فرمانروائے وقت کا اس سنگین جرم سے آنکھیں بچا جانا۔ اسے اگر غیرت و حمیت کا نمونہ مان لیا جائے تو جناب ندوی صاحب اس عقیدہ کے لیے آزاد ہیں۔

ندوی صاحب آگے فرماتے ہیں: ــــــــ

"خلیفۂ وقت کو زکوٰۃ نہ دینا اسلام کی عمارت میں شگاف

ڈالنے کے مرادف تھا جس سے بغاوت اور انکار کا دروازہ کھل جاتا۔“ ؎۱

ان سطروں میں ناچیز راقم کی گزارش یہ ہے کہ بغاوت اور انکار کا دروازہ تو اسی وقت کھول دیا گیا تھا جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیاتِ مبارکہ کی آخری سانسیں لے رہے تھے اور اس عالم میں جیش اسامہ کے جانے اور ان حضرات کے شامل ہونے کی تاکید اکثر فرما رہے تھے۔ لیکن ان صاحبان کی غیرت وحمیت کا انکار کسی طرح اقرار میں نہیں تبدیل ہو رہا تھا خیر یہ تو ذات مبارک نبوی کی خاموش بے اعتنائی تھی۔ غضب یہ ڈھایا گیا کہ جب آخری فرمان قلم بند کرنے کے لئے ”جس کے بعد قیامت تک گمراہی کا راستہ مسدود ہو جاتا“ قلم و کاغذ طلب کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حدودِ ہوش وحواس سے باہر ہی قرار دے دیا گیا۔ اور یہ اس طرح کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا مزاجِ مبارک ہی اس طرح کے سانچے میں ڈھلا تھا۔

حدیبیہ میں حضرتؓ کی تقریر کو بکو اس کہنے کی ہمت تو نہیں پڑی لیکن نبوت میں شک کا اظہار کرنے میں دریغ بھی نہیں کیا گیا ؎۲ اور حدیبیہ کے بعد پیغمبر نے حجۃ الوداع کے بعد

؎۱ المرتضیٰ ص ۱۰۹ ؎۲ مدارج النبوۃ۔ محدث دہلوی

بڑے اہتمام سے مسلمانوں کو جمع فرمایا اور ایک صریح مطلب کا اعلان واضح ترین الفاظ میں کیا جسے اس وقت سمجھا بھی گیا منصُوب کو مبارک باد بھی پیش کی گئی، زبانی ہی سہی لیکن مولا بھی تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن پھر یہ شوریٰ کا انوکھا انداز اور سقیفہ کی جعلی بیٹھک ـــــــ کیا ان بدعتوں نے اسلام کو انار کی کے راستے پر نہیں ڈالا۔؟

مسلمانوں کی فوج کا سالار اپنی پہلی ہی جنگ میں خونریزی اور غارت گری کا بازار گرم کردے اور مقتول کی زوجہ کو اسی وقت عصمت دری کا شکار بنائے۔ کیا یہ واقعہ اسلام کی عمارت میں شگاف ڈالنے کی علامت مانا جائے یا نہیں! کہیے کیا حکم ہے؟ فریاد کروں یا نہ کروں؟

یہ عرض کرنے کی اجازت ہو کہ یہ سب کوئی ایک دو واقعے نہیں ہیں۔ اس طرح کی خلاف ورزیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو حلالِ پیغمبر کو حرام کردینے، حکمِ پیغمبر کو منسوخ کردینے، احکامِ شرع من مانے ڈھنگ سے جاری کرنے اور بہت سی صورتوں میں حکمِ پیغمبر کی خلاف ورزی کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ یہ سب تاریخ کے مسلم الثبوت حقائق ہیں، اشتہار کی ضرورت نہیں لیکن جناب ندوی صاحب کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے

کہ وہ بڑی آسانی سے من چاہی تاریخی شہادت پیش فرما دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اگر ارتداد کی بیخ کنی کرنے میں اور اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش کے مقابلے میں حضرت ابوبکر کا جو کردار تھا وہ انبیاء اور پیغمبروں کا کردار تھا جو انھوں نے اپنے زمانوں میں ادا کیا تھا۔" [1]

چلیئے! اب تک اپنے پیغمبر زد پر تھے اب دوسرے حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کو بھی نشانہ پہ لے لیا گیا۔ ہم کیسے اس عالم و فاضل صاحب قلم کو متوجہ کریں کہ یہ سب فرمانے سے پہلے انھیں تاریخ خمیس، تاریخ طبری، تاریخ کامل ابن اثیر پر ایک نظر ڈال لینا چاہیئے تھی جن کی متفقہ روایت ہے کہ:

"رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص صحابی مالک بن نویرہ بنی تمیم کے سردار قبیلہ تھے۔ بہت ہی خوش صفات، شجاع، شیریں گفتار اور راسخ مسلمان تھے۔ بعد وفات رسولؐ حضرت علی کے اطاعت گزار اور وابستہ دامن رہے۔ جب حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] المرتضیٰ ص۱۱۰

کی رحلت کے بعد مدینہ آئے اور منبر پر حضرت ابوبکر کو خطبۂ جمعہ پڑھتے دیکھا اور بے حد رنجیدہ ہو کر فرمایا کہ

"کیا تم وہی ہمارے تیمی بھائی نہیں ہو؟"

جواب ملا۔ "ہاں"۔

دریافت کیا: "وہ شخص کہاں ہے جسے حضورؐ ہم پر وصی بنا گئے تھے؟"

تسلّی دی گئی کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کے بعد دوسرا کام درپیش ہو جاتا ہے۔

مالک نے کہا: "خدا کی قسم ان کا (حضرت علیؑ) حق ادا نہیں ہوا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے امر خدا اور رسول میں خیانت کی ہے۔"

پھر حضرت ابوبکر کی طرف رُخ کر کے فرمایا: "علی ابن ابی طالب وصی پیغمبر کے ہوتے ہوئے تمہیں کس نے منبر پر چڑھا دیا۔؟"

اس سوال کے جواب میں حاضرین کو حکم دیا گیا کہ اس گنوار کو مسجد سے نکال دو۔ اور فرمانروا کے غلام قنفذ اور خالد بن ولید نے تعمیل حکم میں تاخیر نہیں کی اور مالک کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔"

آپ "حرمتِ ناموسِ صحابہ" کے اس عدیم المثال حادثہ کی تفصیل مذکورہ کتبِ تاریخ میں ملاحظہ فرمائیں۔

زکوٰۃ نہ دینے کے عذر پر جنگ کرنے کے لئے خلیفۂ اوّل نے خالد بن ولید کو مالک بن نویرہ کے مقابلے کو بھیجا۔ براہ کرم یہ نکتہ ملحوظِ خاطر رہے کہ نویرہ اور ان کے ہم خیال زکوٰۃ یا اس کی ادائیگی کے منکر نہ تھے بلکہ وہ حضرت ابوبکر کو زکوٰۃ وصولنے کا حقدار نہیں سمجھتے تھے اور اس پر مصر تھے کہ ہم زکوٰۃ وصیِ پیغمبر کو ہی دیں گے۔ غرض شاہی لشکر کے سردار خالد بن ولید نے مالک بن نویرہ اور ان کے اہل وعیال کو اسیر کیا۔ لوگ چیختے رہے کہ مالک مسلمان ہیں۔ یہ احکامِ خدا کی پابندی کرتے ہیں۔ مگر وہاں تو نظر مالک کی زوجہ اُمّ تمیم بنتِ منہال کے حسن وجمال پر تھی، تو پھر مالک کی جان کیسے بچتی۔

جناب ندوی صاحب کی اسلامی غیرت وحمیت کے نادر نمونے خالد بن ولید نے مالک کو قتل کیا اور اسی شب ان کی زوجہ پر بظلم وجور متصرف ہوئے۔ اسلامی غیرت وحمیت کی نادرہ کاریاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ مالک کے سر کا چولھا بنایا جاتا ہے اس پر حرص وہوا کی کھچڑی پکانے کے لئے دیگچی رکھی جاتی ہے۔

خلافت مآب تک اطلاع پہونچتی ہے، اظہار مسرت فرماتے ہوئے کہتے ہیں: " دوسری عورتیں خالد جیسا بہادر پسر پیدا

کرنے سے عاجز ہیں"۔ ؎۱

خلافت مآب تک ہماری رسائی ہو سکتی تو ہم عرض کرتے کہ خالد جیسے بہادر ببر آپ کی ہمّت افزائی سے اب بھی پیدا ہو رہے ہیں لیکن یہ بات الگ ہے کہ وہ یہ سلوک صرف افراد سے ہی نہیں تاریخ سے بھی کر رہے ہیں۔!!!

لیکن ابھی حضرت عمر مسندِ خلافت تک نہیں پہونچے تھے، اس لئے ارشادِ رسولؐ سے کمالِ غفلت نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے متوجہ کیا کہ خالد نے مالک کی زوجہ سے جو بدسلوکی کی ہے اس کی سزا پتھر ہیں، سزا دیجئے۔ تو ارشاد ہوا:

نہیں کوئی بات نہیں۔ یہ خالد سے بس تاویل میں خطا ہو گئی ہے۔ میں خطائے اجتہادی پر "وہ تلوار نیام میں پھر نہیں رکھ سکتا جسے خدا نے لوگوں پر کھینچا ہے"۔

اگر آپ نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ فرمایا ہے اور ان خالد بن ولید کو پہچانتے ہیں کہ یہ وہی جنگجو ہیں جن کے حملے سے نام نہاد اسلامی لشکر پسپا ہو گیا تھا اور اکابر وقت فرار پر مجبور ہو گئے تھے اور پھر اسی سورما نے جب اسلام کا قلادہ زیبِ گلو کیا تو ساری سورمائی بھلا کر جنگِ حنین میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یک و تنہا چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

؎۱ طبری جلد ۴ صہ ۱۱۔ کامل ابن اثیر صہ ۱۴۹ بحوالہ کلمۃ الحق والغدیر

نے اظہارِ بے زاری فرمایا تھا۔ لیکن ہمارے محترم ندوی صاحب ہیں کہ ایک شخص کو بچانے کے لئے بہتوں کو رُسوا کرنے سے بے فکر ہیں۔ آخر تاریخ کے انبار کو کون کہاں لے جائے؟

یہ تو اصحاب رسُول اور خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ سلوک تھا۔ اب تاریخ آگے بڑھتی ہے۔ اسلام کا پیغمبر داعیِ اجل کو بحکم الٰہی لبیک کہتا ہے۔ آپ کی محبوب دختر باپ کی وفات کے بعد فرماتی ہیں: "مجھ پر جو مصیبتیں پڑیں اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ رات کی طرح تاریک ہو جاتے۔"

معصومہؑ کے ملال کا یہ حال تھا کہ نہ صرف زندگی میں خلیفۂ وقت سے کوئی واسطہ نہ رہنے دیا بلکہ جنازے تک کی شرکت ان کے لئے ممنوع قرار دے دی۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جناب ندوی صاحب کے مسلک والے مورخین و محدثین نے اس حدیث شریف کی روایت سے کہ:

فاطمة بضعة منی من اذاها فقد اذانی ومن اذانی فقد کفر۔

ہم مسلک مورخین ومحدثین کی بات کیا ہے خود جناب ندوی صاحب نے اس ذیل کی حدیث المرتضیٰ کے صـ۱۴۶ پر نقل فرمائی ہے۔ اب یہ فیصلہ اہلِ نظر و خرد پر ہے کہ ایسے کرداروں کی تمثیل و تشبیہ کردارِ انبیاء سے دینا، انبیاء و رسل کے ساتھ گستاخی ہے یا نہیں؟ اور ان اوصاف سے متصف شخص

کیلئے کیا یہ جملے کسی حال میں روا قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ "وہ مسلمانوں کی دعا اور تحسین کے مستحق ہو گئے اور جب تک آسمان و زمین قائم ہے مستحق رہینگے"۔[۱]

خلافت کی پانچویں شرط

ندوی صاحب شرائطِ خلافتِ نبوی میں پانچویں شرط کی قرار داد یوں فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشاء و مرضی کو عمل میں لانے اور اس کی تعمیل کا اس کے اندر بے پایاں جذبہ ہو اور آپ کے راستے سے سرمو انحراف بھی اس کو گوارا نہ ہو اور اس سلسلے میں کسی کی ملامت کا ڈر نہ ہو"۔[۲]

یہ شرط بھی شرائطِ ماسبق کی طرح جناب ندوی صاحب کی خانہ زاد ہے کیوں کہ نہ اسے سقیفہ میں شرط قرار دیا گیا اور نہ اس کسوٹی پر کسی دوسری فرد کو پرکھا گیا۔ لیکن وہاں تو بقول ندوی صاحب:

"حضرت عمر اس پیچیدہ نفسیاتی بات کو سمجھ گئے تھے لہٰذا انھوں نے خلیفہ کے انتخاب میں تاخیر کو روا نہ رکھا

---

[۱] المرتضیٰ ص۱۰۰ [۲] ایضاً ص۱۱۱

منقصت کی جائے۔ یہ کام خود مولانا خوب انجام دیتے ہیں ___!
علام غیوب شاہد ہے کہ رضائے خدا کے سوا کوئی اور مقصد پیش نظر نہیں ہے کیوں کہ جو شخصیت مولانا ندوی کے قلم شعبدہ کار کا ہدف تھی اس کے حفظ مراتب کی ذمّہ داری ارباب علم و قلم کی خموشی کے باعث وجوب کفائی کی حدود سے نکل کر واجب عینی بن گئی تھی۔ بحمد اللہ ہمارے سروں پر ایسے کئی حضرات علماء کا سایہ ہے جو اگر توجّہ فرماتے تو اس منزل کو کہیں بہتر طریقے سے سر کرتے لیکن غالباً یہ شرف ناچیز کے لئے مقدّر تھا۔

حضرت مصنف نے خود اپنی تحریر سے اس بات کا اثبات فرمادیا ہے کہ غیر اسلامی اور خارجی عقائد و روایات کس کی میراث ہیں اور یہ وراثت کہاں سے چلی ہے اور کہاں تک پہونچی ہے!

حسن کے راز نہاں شرحِ بیاں تک پہونچے
آنکھ سے دل میں گئے دل سے زباں تک پہونچے

درباری مورخوں اور مصاحب مزاج واقعہ نگاروں نے تو ابتدا ہی میں ایسی ہوا باندھی تھی کہ حقائق کو اتنا ادھر ادھر بکھیر دیا جائے کہ عام آدمی کیا، دانشمند طبقہ بھی ان کی جمع آوری اور کسی منتج نقطے تک پہونچنے میں حیران ہو جائے۔

میں کسی طرح سے اس ناچیز گزارش کو طول عمل نہیں دینا

خاص طور پر اس لئے کہ کچھ انصار مدینہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ خلیفہ رسول ان میں سے ہو۔ وہ انصار صاحب دار (اصل باشندگان مدینہ منورہ) تھے ان کا خیال بے محل نہیں تھا...... لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع کیا تا کہ شیطان کو مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے اور دلوں میں عناد اور کجی پیدا کرنے کا موقع نہ ملے"۔ [1]

یہاں پر بھی ان شرائط کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اسکی ضرورت کا احساس کیا گیا۔ مگر آج ندوی صاحب اس دن کے ہنگامے کو شرائط و مطالبات کا جامہ پہنا کر اس کی قانونی حیثیت چست و درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ کوشش و کاوش جناب ندوی صاحب کے قلم سے ایک بڑے پتہ کی بات نکل ہی گئی کہ ــــــــ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی و منشاء کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا اس کے اندر بے پایاں جذبہ ہو"۔ [2]

یہاں پر فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر کب؟ کیا حضور صلی اللہ

---

[1] المرتضیٰ ص۱۱۰ [2] المرتضیٰ ص۱۰۰

علیہ وآلہ وسلم کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد ؟ گویا خود ندوی صاحب کو بھی ان حوادث کی سنگینی کا پورے طور پر احساس ہے جو حیاتِ رسول میں رونما ہو چکے تھے جہاں ہر ایک کو مرضی و منشائے رسول کی مخالف سمت میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ یعنی غدیر کے حکم کی کھلم کھلا خلاف ورزی۔ واقعۂ قرطاس کا اندوہناک وگستاخانہ منظر، خلفائے اثنا عشر سے روگردانی آخر حیاتِ رسول میں یہی تو کارنامے نظر آئے ہیں۔ اس لیے جناب ندوی صاحب کو ان شرائط کو بعد وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پائے جانے کی بات گڑھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن اس طباع اہلِ قلم کے لئے راہِ فرار اب بھی ہموار نہیں کیوں کہ جیش اسامہ اگر حیاتِ رسول میں نہیں جاسکا تھا تو ان شرائط سے متصف حضرات بعد وفاتِ رسول تو اسے بھیجتے۔

ہمیں کمالِ ہمدردی ہے کہ غسل وکفن میں شرکت کا عذر بھی جناب ندوی صاحب نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ یہ حضرات اُس کام میں مصروف ہو گئے جس کے انتظام میں جیش اسامہ سے تخلف کیا تھا۔

جناب ندوی صاحب نے اپنے ممدوح کو 'مستثنیٰ' قرار دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ استثنا فرما گئے تھے ؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا پھر بھی اسے حکمِ رسول کی صریحی

مخالفت نہ مانا جائے؟

ندوی صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ:

"وہ جھنڈا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باندھا ہے اس کو میں نہیں کھولوں گا۔"[۱]

جیش اسامہ مدینہ سے رخصت ہونے کے بعد صرف ایک فرلانگ کی دوری پر رک گیا تھا اور اس طرح کچھ حضرات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عیادت کا موقع مل گیا تھا اور مدینے چلے آئے اور پھر یہ خبر لشکر تک پہونچ گئی کہ علالتِ رسول کی شدت بڑھ گئی ہے۔ وہ جیلہ جو طبقہ جو لعنتِ خدا کی حد سے باہر نکلنے کی تمنا میں بڑی مشکل سے لشکر کے ساتھ روانگی پر اپنے کو آمادہ کر پایا تھا، اُسے ایک نیا عذر ہاتھ لگ گیا۔ کیا یہ عذر بھی منشاءِ رسول سے ہم آہنگ تھا؟

بہر حال تاریخ کے صفحات پر وقت نے جو کچھ رقم کر دیا ہے ان سے یہ نتیجہ تو ہاتھ لگ ہی جاتا ہے کہ اسامہ بن زید کی سرداری پر اعتراض کیا گیا۔ بار بار کی تاکید کے باوجود تعمیل حکم میں تاخیر و تعویق کو راہ دی گئی۔ نوبت اس حد تک پہونچی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جیش اسامہ سے تخلف کرنے والوں کو موردِ لعنت

۱ے المرتضیٰ ص ۱۱۲

قرار دے دیا، پھر بھی وہی افراد ہیں جن کو منشا، مرضی رسولؐ پر عمل پیرا ہونے کی سند جناب ندوی صاحب دینے پر مُصر ہیں۔

اور پھر یہ بھی کہ جو خود جیش اسامہ میں شرکت سے روگرداں تھے اب وہی بقول ندوی صاحب کہنے لگے کہ "اس جیش کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ کیا تھا اب واپس نہ ہونے دوں گا۔ وہ جھنڈا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باندھا ہے اس کو میں نہیں کھولوں گا۔"[1]

ندوی صاحب البدایہ والنہایہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ: ——

"جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو عربوں میں ارتداد نے پاؤں نکالے اور یہودیت ونصرانیت سر اُٹھانے لگی، نفاق اُبھرنے لگا اور مسلمان ایسے ہو گئے جس طرح بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑ بکرے سرد راتوں میں سمٹے سمٹائے ہوں کیوں کہ اللہ کے نبی دُنیا سے تشریف لے جا چکے تھے اور یہ حالت اس وقت تک رہی جب تک اللہ نے ان سبھوں کو حضرت ابوبکر کی قیادت پر یکجا نہ کر دیا۔"[2]

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۱۳ [2] المرتضیٰ ص ۱۱۴

ابھی ابھی آپ نے جناب ندوی صاحب کی زیرِ نظر کتاب میں البدایہ والنہایہ کا اقتباس دیکھا جسے فاضل مصنف نے اپنے موقف کی تائید کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ یہ اقتباس ص ۱۱۴ پر دیا گیا ہے۔ لیکن حجاب کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ پلٹا کھانے کے لئے اس بزرگ مصنف کو لمبا سفر نہیں طے کرنا پڑا۔ صفحہ ۱۲۹ تک پہونچتے پہونچتے ارشاد فرمانے لگتے ہیں کہ: ــــــــ

"خاص طور سے اس لئے کہ ابھی ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بند ہوئی ہیں اور آپ کی تدفین بھی عمل میں نہیں آئی ہے۔ مسلمان متحد ہیں یگانگت کی فضا قائم ہے۔"

ابھی کچھ دیر پہلے ارتداد نے پاؤں نکالے تھے، یہودیت ونصرانیت سر اُٹھانے لگی تھی، نفاق اُبھرنے لگا تھا اور مسلمان بارش میں بھیگی ہوئی بھیڑوں کی مانند سمٹے سمٹائے پڑے تھے کہ یکایک انقلاب آگیا مسلمان متحد بھی ہوگئے۔ یگانگت کی فضا بھی قائم ہوگئی۔ اب جناب ندوی صاحب ہی بتائیں کہ اس میں دُرست کیا ہے۔ البدایہ والنہایہ والی بات یا آپ کا ارشاد یا بیک وقت دونوں!

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

کا کتنا دل چسپ مصداق ہے۔ پھر ناموسِ صحابہ کے نگہدارِ اعظم

خالد بن ولید کے لیے حضور کی منقصت کا سامان مہیا فرماتے ہیں۔
یعنی خالد بن ولید کو منشائے رسول پر عامل بتا کر مالک بن نویرہ کے خونِ ناحق کے چھینٹے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامنِ عصمت پر چھڑکتے ہیں۔ یہ بات ذرا کچھ بالواسطہ قسم کی ہو گئی ہے۔ اس لئے ہم براہِ راست استمزاج کرتے ہیں کہ کیا مصنّف علام کی رائے میں جب اشتہائے نفس کے لئے خالد بن ولید مالک بن نویرہ کا خونِ ناحق کر رہے تھے تو اس وقت منشائے رسُول پر عمل کر رہے تھے؟ کہیے کیا حکم ہے؟

یہ دامن پاک عصمت کے ساتھ یہ بے پروائی اس انعام میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے خالد بن ولید کو عراق بھیجا اور انھوں نے اس کے ایک حصّے کو فتح کر لیا۔

ہم اپنے ناظرین بابصیرت کو پھر متوجہ کر دیں کہ یہ وہی خالد بن ولید ہیں جن کے لیے تاریخ ابوالفداء کا بیان ہے کہ

"جب حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ بیشک خالد نے دغا کی اس کے لئے سنگ ساری کا حکم دو، تو ارشادِ خلافت ہوا کہ رجم کا حکم کیسے دوں۔ اس نے تو بس تاویل میں خطا کی ہے۔"

آپ روضۃ المناظر ملاحظہ فرمائیں گے تو یوں پائیں گے کہ:
"جب شیخین کو قتل بے گناہ کی اطلاع ہوئی تو حضرت عمر

نے حضرت ابوبکر سے کہا: خالد نے بے شک زنا کی ہے
تم اس پر حد جاری کرو۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ ایسا
نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خالد نے غلطی بس تاویل میں کی ہے۔
حضرت عمر نے کہا: اچھا یوں ہی سہی۔ مگر اس نے ایک
مسلمان کو قتل کیا ہے اسے قتل کردو۔ حضرت ابوبکر نے
جواب دیا کہ تاویل میں خطا کرنے پر یہ بھی نہیں ہوسکتا۔"

اب ذرا آئیے تاریخ ابنِ جریر طبری کی ورق گردانی کریں۔ طبری خالد کی مراجعتِ مدینہ کی عکاسی کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"جب خالد واپس آئے اور داخل مسجد ہوئے تو حضرت عمر نے خالد سے مخاطب ہوکر کہا کہ تو نے ایک مسلمان (مالک بن نویرہ) کو قتل کیا ہے اور اس کی بیوہ پر تصرّف کیا ہے واللہ میں تجھ کو سنگسار کروں گا! کیونکہ خالد کو گمان تھا کہ حضرت عمر کی یہ باتیں حکومتِ وقت کی رائے کے مطابق ہیں اس لیے خاموش رہنے ہی میں عافیت دیکھی اور حضرت ابوبکر کے پاس پہونچ کر عذر و معذرت اور خوشامد کرنے لگے اور خطا معاف کراکے ہی اٹھے اور جب حضرت ابوبکر نے اپنی رضامندی دے دی تو یہ باہر نکلے اور حضرت عمر سے للکار کر بولے: "اِدھر آ امّ شملہ کے بیٹے"۔ یہ

فقرہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کی سمجھ میں آگیا کہ دربار نے خالد کا قصور بخش دیا ہے اور چپ چاپ اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔"

اس بات کا شکوہ اللہ کے علاوہ کس سے کیجئے کہ جس خطا کار کو منشاء رسول پر عامل اور مرضی رسولؐ کا تابع بنا کر پیش کیا جا رہا ہے وہ ایسا مجرم ہے جسے حضرت عمر تک ایک مسلمان کا قاتل اور مستوجب حد سمجھتے تھے۔ لیکن یہاں کیا ہوتا ہے۔!!

سیاست سزاو پاداش کا تصوّر عدل سے وابستہ ہے اور عدل خود اللہ کے لئے جہاں ثابت نہ ہو وہاں سوال ہی کہاں اٹھتا ہے۔؟

رہے فتوحات ملک، توسیعِ مملکت اور حفظ حوزہ، اس میں خالد اپنی لیاقت ثابت کر ہی چکے تھے اس لئے دوسری لڑائی کے لئے عراق بھیج دیئے جاتے ہیں۔

لیکن آپ اس تماشے کو یہیں پر ختم ہوتا دیکھنے کی تمنّا نہ کریں، ایک اور واقعہ کی حکایت برہان الدین حلبی نے اپنی سیرۃ الحلبیہ میں سبط ابن جوزی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"حضرت فاطمہؑ کی فرمائش پر حضرت ابوبکر نے فدک کا وثیقہ لکھ دیا تھا کہ بلائے ناگہاں کی طرح حضرت عمر کا ورود ہوا اور دریافت کیا کہ یہ کیسی تحریر ہے؟ حضرت ابوبکر نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی جو میراث فاطمہ کو پہونچتی ہے بس اسی کے بارے میں میں نے ان کو سند لکھ دی ہے۔ حضرت عمر بولے سند تو لکھ دی ہے لیکن مسلمانوں کو نفقہ کہاں سے دو گے؟ عرب ضرور تم سے اس میں مناقشہ کریں گے۔۔ یہ کہتے ہوئے جناب معصومہ مظلومہ کے دستِ مبارک سے کاغذ جھپٹ لیا اور چاک کر ڈالا۔"

بُزرگوار!

اب یہ ارشاد ہو کہ آپ کی تراشیدہ شرط خامس پر کیا دونوں حضرات کھرے اُترتے ہیں یا ان میں سے کوئی ایک؟

ایک صاحب لانورث کے معتقد ہونے کے باوجود سندِ میراث قلم بند کر دیتے ہیں، تو یہ کیا ہے؟

دوسرے صاحب فرماں روائے وقت کی تحریر پارہ پارہ کر دیتے ہیں تو کس حق و اختیار سے؟ کیا مرضیٔ رسول پر محض خالد بن ولید عامل تھے یا یہ سب جو ہو رہا ہے یہ بھی مرضیِ رسوؐل پر عمل پیرا ہونے کا نمونہ ہے۔؟!

خلافت کی چھٹی شرط

آیئے اب جناب مصنّف بزرگوار کی معین کردہ چھٹی آخری شرط بھی دیکھنے کا لطف لیا جائے۔ وہ دل چسپ بھی ہے اور فکر و توجہ کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ کیوں کہ یہ شرط کچھ حضرات انبیاء کی دعاؤں اور کچھ جناب ندوی صاحب کی محبوب حکومتوں کی طرف ذہن کو بہر حال متوجہ کرتی ہے ارشاد عالی ہے:

"اس کی خصوصیت یہ ہو کہ وہ دنیاوی جاہ و ثروت کا طالب نہ ہو اور نہ اس کو اپنے عیش و آرام کی فکر ہو، دولتِ دنیا اور لذّتِ عیش کے معاملے سے اس درجہ بے نیاز و یکسو ہو کہ سوائے اس کے قائد و ہادی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی ہو، اپنے یا اپنے خاندان کے لئے کسی حکومت کے قیام اور اس کی توسیع و ترقی کا خواب بھی اس نے کبھی نہ دیکھا ہو جیسا کہ قریب ترین ممالک (روم و فارس) کے حکمراں خاندانوں کا قدیم وطیرہ رہا ہے کہ ان کی

چاہتا اب تو وقت کے دامن میں اتنی گنجائش بھی نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ بعض باتیں کہے بغیر چارہ کار بھی نہیں۔ آپ مؤرخ شہیر المسعودی کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:۔

اخبرنی رجل من اخواننا من اهل العلم قال: كنا نقعد نناظر فی ابی بکر وعمر وعلی ومعاویه ونذكر مايذكره اهل العلم وكان قوم من العامة ياتون فيستمعون منا، فقال لی ذات يوم بعضهم وكان من اعقلهم واكبرهم لحية! كم تطنبون فی علی ومعاويه و فلان وفلان؟ فقلت له فما تقول انت فی ذالك؟ قال! من تريد؟ قلت! علی ما تقول فيه. قال أليس هو ابو فاطمه؟ قلت! ومن كانت فاطمة؟ قال! امرة النبی عليه السلام بنت عائشه اخت معاويه! قلت: فما كانت قصة علی؟ قال: قتل فی غزوة حنين مع النبی صلی الله عليه السلم !! (مروج الذهب و معادن الجوہر ج ۳ ص ۳۳)

ساری مساعی خاندانی سلطنتوں اور بادشاہتوں کی تاسیس و توسیع کے لیے وقف رہی ہے''۔ ؎۱

اس شرط کو نچوڑا جائے تو لب ولباب یہ ہے کہ دنیا کا طالب نہ ہو، اپنی حکومت کا خواب نہ دیکھتا ہو لیکن ذہنِ متجسس اس سوال کے بغیر کیسے رُکے کہ حضرت یہ تو ارشاد ہو کہ وہ حضرات جن کی وکالت میں آپ نے یہ پاپڑ بیلے کیا وہ ان شرطوں کو پورا کرتے ہیں؟

اگر دُنیاوی جاہ وجلال اور اپنی حکومت کی خواہش نہیں تھی تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنازہ چھوڑ کر حکومت سازی کی سعی کیوں کی گئی اور حکومت بن جانے کے بعد زور زبردستی سے بیعت کیوں لی گئی؟ جس کی بابت مولانا رُوم کو بھی کہنا پڑا ؎

اہلِ دُنیا کارِ دُنیا ساختند　　　مصطفٰے را بے کفن انداختند

اور پھر یہ کہہ کر ''سوائے قائد کے کوئی مثال نہ ملتی ہو'' گویا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بڑا احترام انگیز سلوک کیا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں ہرگز ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جو اِن حضرات کے یہاں ملتی ہے۔ کیوں کہ وہاں تو دینِ خدا کو پھیلانے کے لئے اور حکومتِ الٰہیہ کے لئے اِس سرے سے اُس سرے تک چھا جانے کی کوشش تھی۔ یہ الگ بات ہے

؎۱ المرتضیٰ ص۱۰۱

کہ انھیں رفقا اور ساتھی ایسے نہیں ملے جو حوزۂ اسلامیہ کی منشائے خدا و رسول کے مطابق توسیع کی راہ میں مددگار ثابت ہوتے اور اس کے بعد جب ندوی صاحب کو نسبتاً طویل دورِ خلافت کا تجزیہ کرنے کا موقع آیا تو اس شرط کی تقمص و تطبیق کے لیے آپکو خود لکھنا پڑا کہ :

"جہاں تک دُنیاوی راحت و آسودگی سے بے رغبتی دُنیا طلبی سے پرہیز اور مسلمان کے بیتُ المال سے فائدہ اٹھانے میں انتہائی محتاط رویّہ اختیار کرنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں سیرت ابوبکر سے دو مثالیں دینا کافی ہوگا۔" [۱]

یہاں اکتفا کا سوال ہی کہاں اُٹھتا ہے۔ پوری زندگی میں ان دو مثالوں کے سوا تیسری ہے ہی کون سی۔؟ ہم بالفرض ان مثالوں کی صحت تسلیم بھی کرلیں تب بھی تو یہ سوال اُٹھے گا یہ صفت تسلّط خلافت سے پہلے بھی تھی یا نہیں؟ اس کے بارے میں تو آپ نے کچھ فرمایا نہیں اور چناؤ کے وقت اس شرط کے وجود کا کوئی سراغ نہیں ملتا ورنہ الیکشن پروپیگنڈہ کے وقت ہی یہ سب کہا جاتا۔ اس کے کہنے کے لئے تیرہ صدیاں بیتنے پر اپنی طباعی کا فاضل

---

[۱] المرتضیٰ ص۱۱۶

مصنّف کو اعتراف کرنا پڑ رہا ہے۔

خیر آگے بڑھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اپنے یا اپنے خاندان کے لئے کسی حکومت کے قیام کا خواب کبھی دیکھا گیا یا نہیں تو اس کے لئے ہمیں زیادہ زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں خود ہمارے بزرگ مصنف نے ایک جگہ نہیں اپنے رشحات قلم میں بکرات و مرّات اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ قرآن کریم نے اپنے خاص بندوں کی کچھ دُعائیں نقل کی ہیں۔ جناب سلیمانؑ کی دعا تو یہ تھی کہ اسے وسعت دے جو عدیم المثال اور فقید النظیر ہو۔ خلیلؑ خدا نے منصب پانے پر بس نہیں کیا، ذرّیت میں بھی منصب برقرار رہنے کے لئے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوئے۔ کیا یہ سب معاذ اللہ مبتلائے جاہ و حشم ہو کر روم و فارس کی تقلید کر رہے تھے اور جناب سلیمانؑ تو سفرِ توحید کے درمیانی پڑاؤ پر تاریخ کے سامنے آئے ہیں۔ یہ سلسلہ تو خلقتِ بشر اور پہلے نمائندۂ الٰہی کی بے ریا سیرت میں دیکھا جاتا ہے۔

لما حضر آدم الوفاة دعا ابنه شيث فعهد اليه عهده [1]

جب حضرت آدم علیہ السّلام کی رحلت کا وقت قریب آگیا تو

---

[1] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۶۱

حضرت نے اپنے فرزند شیث کو بلا کر ولی عہد مقرر فرمایا"۔

پھر روایت آگے بڑھتی ہے :۔

ان آدم علیہ السّلام مرض قبل موتہ احد عشر یومًا واوصی الی ابنہ وکتب وصیتہ ثم دفع کتاب وصیتہ ال شیث

یعنی "حضرت آدم کو ارتحال سے گیارہ دن پہلے مرض لاحق ہوا اور حضرت نے اپنے فرزند شیث کو وصی مقرر فرمایا اور وصیت نامہ حضرت شیث کے حوالے کیا۔" [۱]

صاحب تاریخ کامل نے بھی یہی حقیقت انہیں لفظوں میں بیان کی ہے اور پھر تاریخ کی شہادت آگے بڑھتی ہے کہ یہ سنّت حسنہ اسی نسل میں جاری رہی۔

شیث نے اپنے بیٹے انوش کو اور انوش نے اپنے بیٹے قینان کو اور قینان نے اپنے فرزند متوشلخ اور متوشلخ نے اپنے بیٹے ملک کو اپنا وصی اور جانشین مقرر کیا۔ اس کے متعلق طبری کی روایت یہ ہے کہ :۔

فلما حضرت متوشلخ الوفاۃ استخلف الملک واوصاہ بمثل ماکان آباءہ یوصون بہ [۲]

---

[۱] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۲۶ [۲] طبری ج ۱ ص ۸۷

یعنی: "متوشلخ کا وقتِ وفات قریب آیا تو انھوں نے اپنے بیٹے ملک کو اپنا خلیفہ اس طرح مقرر کیا جس طرح ان کے آباو اجداد کرام اپنے اپنے جانشینوں کی تقرری کرتے آئے تھے۔"

اور پھر جناب نوحؑ نے یہی کیا۔ حضرت نے بھی اپنے اسلاف معصومین کی طرح اپنے بیٹے سام کو جانشین بنایا۔ تاریخ کامل کا بیان ہے:

لمّا حضر نوح الوفاة قیل لہٗ کیف رأیت الدنیا قال کبیتٍ لہٗ بابان دخلت من احدھما وخرجتُ من الآخر واوصی الی ابنہ سام [1]

یعنی "جب حضرت نوح علیہ السّلام کی رحلت کا وقت آیا تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ دنیا کو آپ نے کیسا پایا؟ تو آپ نے فرمایا اس گھر کے مانند جس میں دو دروازے ہوں ایک دروازے سے داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ اور پھر آپ نے اپنے بیٹے سام کو اپنا وصی و جانشین بنایا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنا خلیفہ حضرت اسحاق کو خود ہی مقرر کیا۔ تاریخ کہتی ہے کہ "اسحق را در دیار شام ولی عہد خلیفہ گردانید" [2]

---

[1] تاریخ کامل ج ۱ ص ۲۶

[2] روضۃ الصفا ج ۱ ص ۶۴

تاریخ پھر آگے قدم بڑھاتی ہے اور ہم کو سراغ دیتی ہے کہ حضرت اسحاقؑ نے بھی یہی کیا۔ یعنی اپنے فرزند حضرت یعقوبؑ کو وصی بنایا۔ حضرت یعقوبؑ نے اسی سنت پر عمل فرماتے ہوئے حضرت یوسفؑ کو جانشین بنایا اور جب حضرت یوسفؑ کا وقت آخر ہوا تو آپ نے اپنے بھائی یہودا کو اپنا وصی و خلیفہ مقرر کیا:

واوصی الی اخیہ یہودا[۱]

حضرت ایوبؑ نے اسی سُنّت مستمرہ کی مطابقت فرمائی کہ اپنے انتقال کے وقت اپنے فرزند کو جانشین کیا جن کا نام ہومل تھا۔ اسی طرح موسیٰ کلیم اللہ نے اپنے بھائی ہارون کو نائب و جانشین بنائے جانے کی درگاہ احدیت میں دُعا کی اور وہ مستجاب ہوئی۔ اور جناب ہارون کی جانشینی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

پھر اسی طرح یوشع بن نون اس منصب پر فائز ہوئے۔

روضۃ الصفا کے الفاظ ہیں:

"حضرت موسیٰ ہارون را طلب کردہ امامت و خلافت خود را باو تفویض فرمود آں فعل را موجب وصایت در نسل او بطناً بعد بطن مقرر گردانید"[۲]

۱؎ تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۸۲

۲؎ روضۃ الصفا ج ۱ ص ۱۲۰

کیا یہ ساری وضاحتیں اور دُعائیں ایرانی اور رومی طرز کی پیروی تھیں یعنی خلافِ اسلام تھیں ؟ جی نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ قطعی ہے کہ نمائندہ الٰہی منصوص من اللہ ہوتا ہے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو جو اختیار د اعزاز و اعتبار بخشا گیا اسے مولائے کُل اشرف الرسل صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے محروم کر دینے کا سوال ہی کہاں اُٹھتا ہے ____

لن تجدوا لسنۃ اللہ تبدیلا

اور جن کو پیغمبروں نے اپنا وصی کہا اور جسے ڈھکے چھپے خاندانی بادشاہت کے نام سے نوازا جا رہا ہے وہ وصایت نہیں پیغمبری کے درجہ پر فائز ہوئے لیکن ظاہر ہے لا نبی بعدی کی حدبندی خود ترجمانِ وحی نے قائم فرمائی تھی ۔

ندوی صاحب اگر انبیاء اور ان کے اوصیاء و جانشینوں کے مسئلے پر غور نہ کر سکے تھے تو کم از کم بنی اُمیّہ اور بنی عباس کی حکومتوں کی تو مختلف انداز سے آپ اپنی متعدد کتابوں میں مدح و ثنا کر چکے ہیں ۔ ان کے یہاں کون سا طریقہ رائج تھا ؟ کیا ان کی ساری مساعی خاندانی سلطنتوں اور بادشاہتوں کی تاسیس و توسیع کے لئے وقف نہیں رہی ہیں ؟ اور کیا آپ اپنے ان ممدوحین کے لیے بھی اس انداز سے کہنے پر تیار ہیں کہ وہ برہمنی اور غیر اسلامی طریقہ کو اپنائے ہوئے تھے ؟

۵

باب پنجم

- ○ خلافت و امامت
- ○ تاویلاتِ خلافت
- ○ حضرت علیؑ مرتضیٰ نے بیعت نہیں کی
- ○ ایں چہ بوالعجبی
- ○ پہلی خطائے اجتہادی
- ○ جناب سیدہؑ کا مطالبہ
- ○ قتل کا حکم
- ○ فدک کا قضیہ
- ○ وراثت کس چیز کی ؟
- ○ آغازِ قضیہ سوالِ بیعت

خلافت و امامت

ندوی صاحب کی یہ چھ شرطیں تھیں جن کا تذکرہ موصوف نے المرتضیٰ میں کیا ہے۔ لیکن ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط نہ تو قرآن و حدیث سے اخذ کی گئی ہے جو اصل ماخذ ہیں، نہ ہی ان معروضہ شرائط پر ان کے ممدوح پورے اُتر سکتے ہیں، جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

پھر آپ نے بیک جنبشِ قلم یہ بھی تحریر کر دیا کہ: "اسی لئے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد جانشین کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہوگا"۔ پھر فوراً ہی یہ بھی لکھ دیا کہ "اگر ایسا کرنا فرائض دینی میں داخل ہوتا اور اس کی صراحت کے ساتھ بتا دینا ضروری ہوتا تو آپ اس حکم کی تنفیذ ضرور فرماتے"۔ [۱]

۱؎ المرتضیٰ ص ۱۲۱

"ہمارے احباب میں سے ایک اہلِ علم نے یہ بتایا کہ ہم اکثر بحث و مباحثہ حضرت ابو بکر و حضرت عمر اور حضرت علی و امیر معاویہ کے بارے میں کیا کرتے تھے اور ان باتوں کا ذکر آتا تھا جو عام طور سے اہلِ علم کیا کرتے ہیں۔ اس موقع پر عوام میں سے بھی کچھ لوگ آجاتے تھے اور ہماری باتیں سنتے تھے۔ ایک دن ایک شخص نے جو ان میں سب سے زیادہ سمجھدار اور لمبی داڑھی والا تھا، کہنے لگا کہ تم لوگ حضرت علی و امیر معاویہ اور فلاں اور فلاں کے لئے کتنی باتیں کرتے رہو گے؟ تو میں نے کہا: اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟ تو اس نے پوچھا کس کے بارے میں۔؟ میں نے کہا حضرت علی کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ تو کہنے لگا کیا وہ فاطمہ کے باپ نہیں تھے؟ میں نے کہا فاطمہ کون تھیں؟ کہا: نبی کی بیوی، حضرت عائشہ کی بیٹی، امیر معاویہ کی بہن۔ میں نے کہا: علی کا کیا قصہ تھا تو کہنے لگا کہ علی جنگِ حنین میں پیغمبرؐ کے ساتھ قتل ہو گئے۔"

مسعودی کے اس بیان کی روشنی میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کے بارے میں عام مسلمانوں کی واقفیت کی سطح بہ سہولت سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ صورت حال قریب العہد مسلمانوں کی ہے۔ اب

اور اب اسے گھبراہٹ کہیئے یا حق کا بول بالا تھا کہ بلا فاصلہ آیۂ بلّغ تحریر فرمادی اور واقعۂ قرطاس بھی نقل کر دیا۔ لیکن ضرورت تو یہ تھی کہ اس جگہ ان تمام دلائل کا ذکر کر دیتے جو خلافت و امامت کے لیے شیعہ بھی پیش کرتے ہیں اور ان کو رَد کرتے، مگر جو رَد کی بھی تو ایسی کہ تضاد کا مجموعہ بن گئی ۔ ایک طرف فرمایا کہ کسی کو مقرر نہیں کیا۔ پھر آیۂ بلّغ کی تشریح نہ کی. اس آیۃ کے نزول کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا کیا یہ بھی بیان نہ فرمایا۔ کیوں؟

"مولیٰ" کی جو تفسیر آپ نے ص۵۳ پر فرمائی ہے اس سے کوئی تعلق اس آیت کا تو نہیں؟ کچھ آپ کی تفسیر میں بھی اسی طرح کی باتیں ہیں یہ اور بات ہے کہ ابن تیمیہ، محدّث دہلوی اور آپ اس کی تاویل کر لیتے ہیں. لیکن آپ کے ہم مسلک اہم علماء نے آیت کے ساتھ ساتھ جن قضایا کا تذکرہ کیا ہے اسے بھی تو ذکر کیجیئے۔ پھر اپنی تائید میں آپ نے استاذ عباس محمود العقاد کا بیان پیش کرنا چاہا ہے۔ لیکن یہاں بھی شاید توجہ کی کمی رہ گئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ کسی کو منتخب نہ کیا، اور عباس محمود العقاد کی جو عبارت آپ نے اپنی تائید میں پیش کی ہے وہ یوں ہے:

"آپ کا ایک اشارہ بھی بہت تھا جیسے حضرت ابو بکر کو جب نماز کے لیے بڑھایا تو اشارہ کر دیا اور سبھوں نے سمجھ لیا کہ آنحضرت کا کیا منشا ہے۔" (المرتضیٰ ص۱۲۴)

گویا اشارہ کیا بھی اور نہیں بھی کیا۔ آخر صاف صاف کیوں نہیں کہتے
اشارہ کیا تو تھا اور ضرور کیا تھا بلکہ صاف صاف اور واضح اعلان بھی کیا مگر
وہ کسی اور کے لئے تھا اور اب مصداق کی تبدیلی کے لیے اس طرح
تضاد کا سامنا ہو رہا ہے۔ پھر ایک طرف آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"اسلام نے موروثی جاگیرداری کے ان دونوں طریقوں کا خاتمہ کر دیا۔" [1]

دوسری طرف آپ یہ فرماتے ہیں کہ:

"نیز یہ کہ عربوں کے رواج کے مطابق بھی یہ بات تھی کہ وہ آزادانہ رائے مشوروں سے کوئی اہم بات طے کرتے اور اپنے درمیان سربراہ مقرر کرتے جو عمر میں بڑا ہو..... یہ بات بھی ان کے یہاں نسلوں سے چلی آ رہی تھی۔"!! [2]

تو جو بات اسلام نے ختم کر دی تھی وہ پھر کیسے باقی رہی اور اگر باقی رہی تو آپ کی تحریر کے مطابق یہ طریقہ غیر اسلامی تھا۔!!
پھر آپ نے اسی صفحہ پر جسٹس امیر علی کی تاریخی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"عربوں میں کسی قبیلہ کی سرداری اور سربراہی موروثی نہیں ہوتی، اس کا انحصار انتخاب پر ہوتا ہے۔" [3]

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۳۰ [2] ایضاً ص ۱۳۱

اب ندوی صاحب آپ کی بات تسلیم کی جائے یا جسٹس امیر علی کی تجویز؟ پھر فوراً ہی آپ اگلے صفحہ پر خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس انتخاب کی بدولت مسلمان اور عرب اس قبائلی اور موروثی طرز حکومت سے محروم رہے جس کی بنیاد نسب اور خون پر ہوتی ہے"۔ ؎

اور امیر علی صاحب کہتے ہیں کہ عربوں میں سرداری اور سربراہی موروثی نہیں ہوتی۔ اس کا انحصار انتخاب پر ہوتا ہے۔

اب کسے حق سمجھا جائے۔؟ ایک تحقیقی کتاب میں قاری کے ساتھ ایسا مذاق۔!! مگر آپ کی مجبوری وہی ہے جو اس سے پہلے ابن تیمیہ اور محدث دہلوی کی رہی کہ دلائل کچھ دیتے ہیں اور مصداق کوئی اور ہوتا ہے۔ (تطبیق کے مرحلے میں الٹ پھیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اس طرح تحریر ایک مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہے) اور اسی الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر آپ یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ بنو ہاشم کی دینی و روحانی پیشوائی کے ساتھ ایک دنیاوی سلطنت بھی قائم ہو جاتی اور اسلام میں ایک پاپائیت وجود میں آتی۔ گویا آپ نے بنو ہاشم کی دینی و روحانی پیشوائی تو تسلیم کر ہی لی۔ اور اسی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی فرمایا تھا۔

اس تحریر سے بھی واضح ہو گیا کہ دین و سیاست کی جدائی کے بھی

؎ المرتضیٰ ص۱۳۲

آپ قائل ہیں اور جن خلفاء کی آپ وکالت کر رہے ہیں وہ صرف دنیاوی حکمراں تھے۔ ان کو دینی و روحانی پیشوائی کا کوئی حق نہ تھا اور اس دلیل سے آپ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اگر کوئی دینی و دنیاوی سربراہی کا دعوےدار ہو اور یہ سلسلہ خاندانی اور موروثی طریقہ سے چلتا نظر آئے تو وہ بہ قول آپ کے :

"اس کے بھی وہی تلخ نتائج اور مضر اثرات امت مسلمہ اور مسلم معاشرہ میں ظاہر ہو کر رہتے ہیں جن کی نظیر مسیحی پاپائیت، مجوسی اور برہمنی پیشوائی میں ملتی ہے۔" [1]

اور یہ سلسلہ وہی ہے جسے بنی اُمیہ اور بنی عباس کے نام سے آج ہم یاد کرتے ہیں۔ کیا واقعی یہ دونوں سلطنتیں آپ کے اس تبصرہ کی مستحق ہیں اور کیا بنی عباس و بنی امیہ کی سلطنتوں نے جو مظالم امتِ اسلامیہ پر ڈھائے تو جس پاپائیت کا آپ خوف دلا رہے ہیں اس کا عملی مظاہرہ انھوں نے مختلف اوقات میں نہیں کیا۔؟

خلافت کے شرائط

ندوی صاحب نے تو اپنی طرف سے شرائطِ خلافت پیش بھی فرمائے اور حتی الامکان اس کی کوشش بھی کی کہ ان کے ممدوح ان شرائط

---

[1] المرتضیٰ صـ ۱۳۳

پر پورے اتر آئیں۔

لیکن جیسا کہ قارئین نے ملاحظہ فرمایا، نہ شرائط قرآن و حدیث سے پیش کیے، نہ شرائط پر افراد پورے اُتر سکے۔ لیکن خلافت کے لئے واقعی شرائط کیا ہیں اور قرآن کریم اس سلسلے میں کیا رہنمائی کر رہا ہے:

(۱) وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ؕ ——— البقرۃ۔ ۳۰

(۲) قال انی جاعلك للناس اماماً ؕ قال ومن ذریتی قال لا ینال عهدی الظالمین ؕ

——— البقرۃ۔ ۱۲۴

(۳) قال ان الله اصطفاه علیکم وزادهٗ بسطةً فی العلم والجسم ——— البقرۃ۔ ۲۴۷

(۴) افمن یهدی الی الحق احق ان یتبع امّن لا یهدی الا ان یهدی ؕ ——— یونس۔ ۳۵

(۵) وخلقناهم ائمةً یهدون بامرنا ؕ

——— الانبیاء۔ ۷۳

(۶) ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون الله من اولیاء ثم لا تنصرون ؕ ——— هود۔ ۱۱۳

ان آیات سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں :

(۱) خلافت ایک ایسا عظیم الشان منصب ہے جس کے حصول کی تمنّا اور شوق ملائکہ کو بھی پیدا ہوا۔

(۲) خلافت اور الٰہی منصب صرف خداوند کریم کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور خدا ہی خلیفہ منتخب کرتا ہے اور خداوند عالم اس سلسلے میں کسی خواہش و تمنا کو جائز نہیں قرار دیتا۔ انی اعلم ما لا تعلمون ط کہہ کر گویا اس سلسلے میں کسی انتخاب یا کسی اور طریقہ کار کی نفی کر دی۔

(۳) خلافت کا مستحق صرف وہی ہے جو سب سے افضل ہو، افضل کی موجودگی میں مفضول خلیفہ نہیں بن سکتا۔ ملائکہ و ابلیس دونوں نے اس مسلمہ کلّیۃ کو پیش کیا۔ لیکن خداوند عالم نے اس کلّیہ کو مانتے ہوئے یہ بتا دیا کہ دعوائے افضلیت غلط ہے۔ تم لوگ آدم سے افضل نہیں ہو۔!

(۴) خلافت کا مایۂ امتیاز علم ہے اور علم بھی وہ جو خداوند کریم کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہو۔ جس کا نمونہ رسولِ امیؐ ہیں کہ فرما رہے ہیں :- انا مدینۃ العلم وعلی بابھا

" میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔"

(۵) خلافت اور امامت ظالموں کو نہیں مل سکتی اور ظلم کے

اقسام میں ایک بڑا ظلم کفر ہے۔ یعنی جن لوگوں نے اپنی عمر کے کسی حصے میں کفر کو اختیار کیا وہ خلافت و امامت کے اہل و حقدار نہیں اور جس طرح نبوّت خلافتِ الٰہیہ ہے اور اس کے لئے علم کی ضرورت ہے اسی طرح خلافتِ نبی اور رسول کے لیے بھی علم کی ضرورت اور امامت کے لئے ظلم سے بَری ہونا ضروری ہے۔

اس بات کو مولوی شاہ ولی اللہ صاحب قرۃ العینین میں تسلیم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"معلوم است کہ خلافت مشروط است بہ صفات کمال واحق بالخلافت اکمل مردم است درآن صفات۔"[۱]

ملائکہ اور آدم کے سلسلے میں محی الدین عربی اپنی مشہور کتاب "درّ مکنون" میں رقم طراز ہیں کہ:

لما اراد اللہ ان یثبت الحجۃ لآدم علیہ السّلام عن الملٰئکۃ واراد ان یعلمھم ان آدم احق بالخلافۃ منھم قال یاآدم انبھم باسمائھم ثبت العجز علی الملٰئکۃ التی لسألھم ایاھا عجزوا عن علمھا فجعل آدم خلیفۃ لکونہ

---

[۱] قرۃ العینین ص ۲۹

احق بالخلافة منهم لفضل علمه فمن وصل الی هذه الفضیلة فقد اختصه الله تبارك و تعالیٰ من بین عباده وجعله افضل اهل زمانه۔

یعنی: "جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ آدم کی خلافت کے لیے ملائکہ پر حجت قائم کرے اور ان کو بتائے کہ آدم ان سے زیادہ مستحق خلافت ہیں تو کہا: اے آدم! انھیں ان سب کے نام بتا دو۔ پس جب آدم نے ملائکہ کو ان کے نام سے آگاہ کر دیا تو اس سوال میں جو استحقاق خلافت کے سلسلے میں پوچھا گیا ان کا عجز ظاہر ہو گیا اور ملائکہ ان کے علم سے عاجز رہے۔ پس آدم کو خلیفہ بنا دیا گیا کیوں کہ وہ ملائکہ سے کمال علم کی بنا پر خلافت کے زیادہ حقدار ثابت ہوئے۔ اب جو شخص بھی اس مرتبۂ علم و مقام پر پہونچا ہو اسے خداوند عالم اپنے بندوں میں سے اپنی خلافت کے لیے مخصوص فرما لیتا ہے۔

تاویلاتِ خلافت

جناب ندوی صاحب رقمطراز ہیں کہ:

"حضرت ابوبکر کی بیعت کوئی اتفاقی بات نہ تھی جس کو کہیں کہ بات بن گئی اور نہ کوئی سازش تھی (اور پھر چند جملوں کے بعد ہی تحریر فرماتے ہیں) نیز یہ کہ عربوں کے رواج اور معیار کے مطابق یہ بات تھی کہ وہ آزادانہ رائے مشورہ سے کوئی ..... اہم بات طے کرتے اور اپنے درمیان سربراہ اس کو مقرر کرتے جو عمر میں بڑا ہو اور اخلاص و بصیرت میں افضل ہو۔ تجربہ کار، دُنیا کے سرد و گرم کو آزمائے ہوئے ہو۔ فوج اور عوام کی سربراہی کا سلیقہ رکھنے والا ہو یہ بات ان کے یہاں نسلوں سے چلی آرہی تھی۔" [۱]

اسی عبارت میں محترم ندوی صاحب نے ہر اعتبار سے پیش بندی کی کوشش فرمائی ہے۔ لیکن اب اسے کیا کیا جائے کہ جس مسئلے کو وہ حل کرنا چاہتے ہیں وہ لاینحل ہے ورنہ خود آپ کی عبارتوں میں

---

[۱] المرتضیٰ صد ۱۳۰

اتنا تضاد کیوں ؟ کہ یہاں آپ فرما رہے ہیں کہ حضرت ابو بکر کی بیعت کوئی اتفاقی بات نہ تھی اور صرف ایک ہی صفحہ پہلے تحریر کر چکے تھے کہ حضرت عمر سقیفہ بنی ساعدہ میں مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہوئے اور حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کی دعوت دی ۔ پھر فیصلہ اس طرح سُنایا کہ: "چنانچہ لوگوں نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی "۔

کتنی سادگی اور آسانی سے سقیفہ کی کارروائی نقل کی گئی اور فیصلہ ہوگیا ۔ کیا واقعی ایسا ہوا تھا ؟ گروہ انصار اور مہاجرین میں بھی تو کچھ ہوا تھا جس کی طرف آپ نے خود بھی ص ۱۲۷ پر ہلکا سا اشارہ کیا ہے ۔ پھر سعد بن عبادہ کی مخالفت تو سب کو تسلیم ہے ۔ اسے بھی آپ نظر انداز کر گئے ۔ اس کے علاوہ پہلے تو حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کی بیعت کرنا چاہی تھی !! وہ کیوں ، کیا اس میں بھی کوئی راز تھا ؟

عبّاس محمود العقاد تو فرما گئے کہ آپ کا ایک اشارہ بھی بہت تھا جیسے حضرت ابو بکر کو جب نماز کے لئے بڑھایا تو اشارہ کر دیا اور سبھوں نے سمجھ لیا کہ آنحضرتؐ کا کیا منشا ہے [1] تو اس واضح اشارے کو حضرت ابوبکر نے کیوں نہیں مانا ۔ اور آپ نے حضرت ابو بکر کی جو خصوصیات نقل فرمائی ہیں ان سب کی طرف بھی کسی صحابی نے اشارہ نہ کیا ۔ بس بقول آپ کے حضرت عمر نے دعوت دی اور اُمّت نے وہ دعوت

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۲۴

اگر چودہ سو سال بعد ایک مشہور مسلم تنظیم کے معزز و تعلیم یافتہ رہنما "ثقلین" اور اس سے متعلق حدیث سے ناواقف اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک سنجیدہ پروفیسر "اہل بیت" سے ناآشنا ہوں تو مولانا ندوی کے اسود قلم پر کون روک لگا سکتا ہے، وہی مصرعہ صادق آتا ہے:

قلم سے اپنے جو چاہو سو میرے یار لکھو

جنوں کا نام خرد اور خرد کا نام جنوں رکھنے پر کون روک لگا سکتا ہے؟

ضرورت تو نہیں مگر آپ کی تفریح طبع کے لئے امتِ اسلامیہ کی مبلغ معلومات کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ ہم بخیال اختصار ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں:۔

"میرے بعض ساتھیوں نے نقل کیا ہے کہ بغداد میں عامہ میں سے ایک شخص نے والیٔ شہر سے ایک شخص کی شکایت کی کہ وہ زندیق ہو گیا ہے تو والی نے اس شخص کے مذہب کے بارے میں سوال کیا۔ اس شاکی نے کہا کہ وہ مرجیٔ قدری، ناصبی اور رافضی ہے (اور پھر والی کے جواب کی تفصیلات میں اس نے بتایا کہ) وہ معاویہ بن خطاب سے بُغض رکھتا ہے جس نے علی بن العاص سے جنگ کی تھی (اس علمی انکشاف پر والی نے کہا) میں تیری کس بات پر حیرت کا اظہار کروں تیری علمی معلومات

قبول کرلی۔ گویا نہ مہاجر کچھ کہہ سکے نہ انصار بولے۔ نہ سعد نے کوئی احتجاج کیا، نہ بنی ہاشم نے مخالفت کی اور نہ ہی امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے انکار کیا اور نہ بضعۃ الرسولؐ نے کوئی شکوہ کیا۔ !!!

جبکہ ان تمام حضرات کے سلسلے میں مفصّل داستان خود آپ کی کتابوں میں موجود ہے اور اس لئے آپ نے کمال ہوشیاری سے ان مسائل سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی آپ یہ لکھ گئے "مشہور[۱] ہے کہ حضرت علیؑ نے ضروری سمجھا کہ فاطمہؑ کے احساسات و جذبات کا کسی درجہ لحاظ کریں اس لئے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی! پھر جب فاطمہؑ چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں تو حضرت علیؑ نے برسرِ عام بیعت کی" گویا آپ نے یہ تو بہر صورت اقرار فرمالیا کہ جناب سیدہؑ نے نہ صرف بیعت نہیں کی بلکہ وہ اتنی ناراض تھیں کہ ان کے لحاظ میں ..... حضرت علی نے بھی بیعت نہیں کی۔

اب اس کے بعد اگر آپ یہ بھی تحریر کر دیتے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی کہ کسی واجب دینی و شرعی مسئلہ میں کسی شخص کا لحاظ کر کے اسے ترک کرنے کا اختیار کس حد تک ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ چوں کہ حضرت علیؑ نے بیعت نہیں کی۔ اب اس کے لیے کوئی بہانہ تلاش کیا جا رہا ہے۔؟!

۱؎ المرتضیٰ ص ۱۵۱

رہ گئی بات اگر آپ کی بعض کتابوں میں بیعت کا ذکر ملتا ہے تو بعض کتابوں میں انکارِ بیعت کا ذکر بھی ہے ۔ پھر آپ اس پر کیوں مصر ہیں کہ بیعت کی ؟ اور ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے کہ بیعت نہیں کی اور جس بیعت کا ذکر آپ کر رہے ہیں اس کے لئے حالات تو انھیں کتابوں میں یہ ہیں کہ کبھی قتل کی دھمکی تو کبھی گلے میں ریسمان یہ سب کس لیے ؟ اور جناب سیدہؑ نے تو بیعت نہیں کی ۔ ان کے لئے آپ کیا کہیں گے ؟ احراقِ بیعت سیدہؑ کا ذکر تو کسی نہ کسی حد تک ابن تیمیہ نے بھی کیا ہے باقی تو آپ کی تمام کتابوں نے بالاتفاق اسے لکھا ۔ البتہ آپ نے اس سے گریز کیا ہے ۔ وجہ ہر کس و ناکس کے لیے ظاہر ہے کہ احراقِ بیعتِ سیدہؑ کی دھمکی ہی اس لیے تھی کہ اگر بیعت نہ کی جائے تو سزا ملے گی ۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں ؟

کیا احراق درِ سیدہؑ اور اس سے متعلق تمام واقعات نادرست ہیں ؟ اور اگر آپ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں تو پھر کس چیز کی پردہ داری ہے ؟ اس موقع پر آپ نے العقاد کی تحریریوں بھی نقل کی ہے کہ :

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت علیؑ کی عمر تیس سال سے دو تین ہی سال زیادہ ہوئی تھی ۔ یہ بات ایک دشوار گزار مرحلہ تھا جس کا طے کرنا

اس قوم کے لئے ممکن نہ تھا جو عمر اور بزرگانہ سن کو اہمیت دیتی تھی۔" (العبقریات الاسلامیہ للعقاد ص۲۴۱)

العقاد کی اس دلیل کو آپ نے اپنی چھ معرکۃ الآرا شرائط کے بعد تحریر کیا ہے اب آپ ہی بتائیں کہ وجہ انتخاب وہ چھ شرائط تھیں یا سن کا کوئی مسئلہ تھا اور وہاں قوم نے صرف سن کی بنیاد پر ہی سارا فیصلہ کیا تھا؟

اگر سن کو قوم اہمیت دیتی تھی تو اس نے خود حضرت ابوبکر کے والد کو کیوں نہ بلوالیا؟ اور سقیفہ میں موجود دوسرے سن رسیدہ حضرات کی طرف توجہ کیوں نہیں کی گئی۔؟ پھر طالوت و جالوت کے واقعہ میں قرآنِ کریم نے واضح جواب دیا ہے...... جو الٰہی نمائندوں کے انتخاب پر اپنی طرف سے چوں و چرا کرتے ہیں اور اپنی طرف سے شرائط پیش کرتے ہیں :۔

"تو وہ کہنے لگے ان کو ہمارے اوپر حکومت کرنے کا حق کہاں حاصل ہے ہم بادشاہت کے ان سے زیادہ حقدار ہیں (کیونکہ) ان کو کشائش مالی نہیں دی گئی (تو) پیغمبر جناب شمویلؑ نے فرمایا بے شک خداوند عالم نے ان کو تم پر فضیلت دی ہے اور ان کو علم و جسامت میں زیادتی مرحمت فرمائی ہے (اور پھر یہ بھی ہے) اللہ تعالیٰ اپنی سلطنت جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور خدا واسع اور علیم ہے۔"

(سورہ بقرہ ترجمہ آیت ۲۴۷)

ایش چہ بُو العجبی

"جن لوگوں نے انقلابی تحریکوں اور دعوتی کوششوں کی تاریخیں پڑھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ بہت سی تحریکیں شروع تو ہوئیں خالص دین اور اصلاح کے لیے مگر ان کی انتہا ہوئی ایک خاندان یا گھرانے کی جاہ و جلال، حکومت و سلطنت کے حصول پر یا سیاسی و فوجی قسم کا نفوذ حاصل کرنے پر۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جن کا دینی حاسہ قوی ہے اور جن کو اللہ نے فہم و بصیرت عطا کی ہے وہ اس طرح کی تحریکوں سے مشکوک و خائف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں ان کا کیا انجام ہوگا۔"[1]

اس پورے پیراگراف میں کہیں سے بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ مولائے کائنات علی مرتضیٰ علیہ السّلام کی مفصّل سوانح حیات کی کسی کتاب سے اقتباس ہوگا۔

البتہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ "جن کو اللہ نے فہم و بصیرت عطا کی ہے" وہ کسی حد تک بیدار رہتے ہیں۔ پھر بارھویں صدی میں جزیرۃ العرب میں ایک ایسی ہی تحریک ہوئی تھی ممکن ہے وہ بعض لوگوں کے خیال میں خالص دینی اور اصلاح کے لئے

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۳۵

رہی ہو!! لیکن انجام کار کیا ہوا کہ صرف ایک خاندان کی حکومت ہی نہیں بلکہ ملک کا نام بدل کر خاندان کے نام پر ہوگیا۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ جن لوگوں کو ندوی صاحب کے بقول اس تحریک سے مشکوک اور خائف رہنا چاہیئے تھا وہ بجائے مشکوک اور خائف ہونے کے مدح سرائی اور بے جا تائید میں مصروف نظر آنے لگے اور طرح طرح کے انعامات سے ان کو نوازا گیا اور ہر ظلم کو بخوشی قبول بھی کرتے رہے۔ قول و عمل کا یہ تضاد ہر ایک کو دعوتِ فکر دے رہا ہے!!

ویسے جانشینانِ پیغمبرؐ کے سلسلے میں دوست و دشمن سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہاں جاہ و جلال اور حکومت و سلطنت کا تصوّر تو یوں بھی نہ تھا کیوں کہ سیرتِ رسولؐ کی تاسی کرنے والے جاہ و جلال کس بات پر دکھاتے۔ البتہ صدر اسلام سے آج تک جن لوگوں نے اسلام کے نام پر حکومت حاصل کی اور جاہ و جلال کے خوب خوب مظاہرے کئے ان کی مدح سرائی کرنے والے وہی افراد ہیں جو مولائے کائنات علی مرتضیٰ علیہ السّلام کی ولایت کے سلسلے میں طرح طرح کے خدشے اور وسوسوں میں مبتلا ہیں۔

پھر جناب ندوی صاحب ہرقل اور ابوسفیان کی گفتگو سے جو نتیجہ اخذ کرانا چاہتے ہیں تو پھر ان تمام انبیاء کی دعوت اور تبلیغ خطرے میں آجائے گی جن کے آباؤ اجداد نبی تھے۔ اس لئے اگر ہرقل ہی کی منطق

درست ہے تو پھر نہ آلِ ابراہیم کو کوئی حق رہ جاتا اور نہ آلِ داؤد کو۔!
اور پھر ایک ہی صفحہ بعد ندوی صاحب کو اپنی بات میں اتنا وزن محسوس ہونے لگا کہ تحریر فرما گئے:

"یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس علیم و غالب ذات کا تقدیری فیصلہ تھا کہ مسلمانوں کی سربراہی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد متصلاً آپ کا گھرانہ یا خانوادۂ ہاشمی کا فرد نہیں ہوا۔" ۱ے

گویا اب "تقدیری فیصلہ" کے عنوان سے ہر ظلم کو الٰہی فیصلہ مان لیا جائے؟ جنابِ ہابیل کی شہادت غالب ذات کا تقدیری فیصلہ! اور اس کے بعد سے ہجرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جتنے حادثات ہوئے جتنے جرائم ہوئے جتنے مظالم ہوئے سب کے سب "تقدیری فیصلہ کی سپر" کے تحت گویا صحیح ہو جائیں گے۔!!

اور اس موقع پر الذہبی کے حوالہ سے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی تائید بھی پیش کی گئی۔ جبکہ امام حسن مجتبیٰؑ نے ایک دو بار نہیں متعدد بار اسی ظلم پر احتجاج کیا ہے اور اس سلسلے کا وہ مشہور واقعہ ہے جب کسی کو منبرِ رسولؐ سے اترنے کے لیے امام حسن علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ ۲ے

۱ے المرتضیٰ ص ۱۳۶ ۲ے تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۸

اب ندوی صاحب آپ کے اس حوالے کو مانا جائے یا مسلسل ان احتجاجات کو مدّنظر رکھا جائے جن کا ذکر مختلف اہم علماء نے کیا ہے۔

آخری بات ندوی صاحب نے اس سلسلے کی یہ کہی ہے کہ:

"اس کے بعد حضرت علیؑ اس وقت منصبِ خلافت پر فائز ہوئے جس وقت صحابۂ رسولؐ بلکہ پوری اُمّت میں ان سے افضل اور ان سے زیادہ مہماتِ خلافت کا بار اُٹھانے والا کوئی دوسرا نہیں رہ گیا تھا"[۱]

گویا اب نہ کوئی خاندانی جھگڑا رہا، نہ کسی کو اعتراض کا موقع رہا ــــ بقول ندوی صاحب ــــ "چنانچہ اس موقع پر شک و شبہ کی گنجائش ختم ہو گئی اور کسی کا منھ نہیں رہا کہ وہ بدگمانی سے کام لے یا زبانِ اعتراض وطعن دراز کرے۔" صرف اس بنا پر کہ اب امّت میں ان سے افضل کوئی نہیں رہ گیا تھا؟ گویا شرائطِ خلافت میں ایک مرتبہ پھر آپ نے اپنی تمام شرائط کو بالائے طاق رکھ کر افضلیت کی دلیل مان لی!!

تو حضورؐ والا یہ دلیلِ افضلیت تو ۱۱ھ سے موجود تھی اس افضلیت کی بناء پر اور حکمِ رسولؐ سے ہم نے علی علیہ السلام کو خلیفۂ بلافصل مانا۔

۱ے المرتضیٰ ص ۱۳۶

اور اس افضلیت کا اقرار تو ابنِ ابی الحدید شارح نہج البلاغہ اپنے مقدمہ میں واضح انداز میں کر چکے ہیں جن کو بار بار آپ شیعہ لکھنے پر مصر ہیں، جبکہ وہ حضرت علیؑ کو سب سے افضل ماننے کے باوجود چوتھا خلیفہ مانتے ہیں!!

رہ گئی افضلیت کی بات تو صدرِ اسلام سے آج تک سب ہی اس بات پر متفق ہی نہیں یقین بھی رکھتے ہیں کہ بعدِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام سب پر ہر طرح سے فوقیت رکھتے تھے وہی فوقیت جس کا اقرار خود ندوی صاحب کر رہے ہیں کہ:

"پوری امتِ مسلمہ میں ان سے افضل اور ان سے زیادہ مہماتِ خلافت کا بار اُٹھانے والا کوئی دوسرا نہ رہ گیا تھا۔" [۱]

سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

بعد از مصطفٰی در کل عالم

نہ بود فاضل تر و بہتر ز حیدر

وہ شجاعت، عبادت، قضاوت، ریاضت، علم، ورع، تقویٰ و زہد میں ہی نہیں بلکہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لئے کبھی انا مدینۃ العلم وعلی بابھا فرمایا کبھی اقضاکم علی بن ابی طالب کہا۔ پھر حدیثِ نور اور

---

[۱] المرتضیٰ ص ۱۳۵

حدیثِ طیر وغیرہ تو آپ کی انہی کتابوں میں موجود ہیں جن کے حوالے آپ بار بار دے رہے ہیں، ورنہ امام احمد بن حنبل مسند جز ثالث ص۴۸۲ سنن ابن ماجہ ص۵۶، صواعق محرقہ باب تاسع فصل ثانی، حدیث السادس ص۷۲، حاکم مستدرک علی الصحیحین ج ۳۔ صحیح بخاری جز ثانی باب مناقب علی کی یہ حدیث کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

علی منّی وانا منہ ولا یودی منی اِلّا انا وعلی

"رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علی مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں اور میری اس امانت (پیغام الٰہی) کو سوائے میرے یا علیؑ کے کوئی اور ادا نہیں کرسکتا۔"

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا کہ:

من اذی علیاً فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ

یعنی: "جس نے علی کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو ستایا۔"[۱]

کبھی خود حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے علی! تمہارا دوست میرا دوست اور میرا دوست

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص۴۸۳، صواعق محرقہ باب تاسع فصل ثانی ص۷۳

الحاکم مستدرک علی الصحیحین ج ۳ ص۱۲۲

خدا کا دوست ہے۔ تمہارا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دشمن خدا کا دشمن ہے، اور ویل ہو اس پر جو میرے بعد تم سے بغض و عداوت رکھے۔"

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

لعلی بن ابی طالب حبیبك حبیبی وحبیبی حبیب اللہ وعدوك عدوی وعدوی عدو اللہ والویل لمن ابغضك بعدی!![1]

اگر صرف ان ہی احادیث پر توجہ کی جائے اور فضائل کی تمام دوسری واضح احادیث سے صرف نظر کر لیا جائے تو کیا فضیلت کے لئے اور پیروی کے لیے کافی نہیں؟

کیا ان واضح احادیث کے بعد بھی ذہن کے کسی گوشے میں یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ معاذ اللہ علی کا سن کم تھا اس لیے ان کو یہ ذمہ داری نہیں دی جا سکتی؟ جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم علَم دیتے وقت سن پر توجہ نہیں دیتے۔ اور بعثت کے وقت اپنی جانشینی کے لئے واضح اعلان کرتے وقت بھی صرف گیارہ سال کے سن کو بھی نہیں دیکھتے اور خداوند عالم بھی سورۂ توبہ کی ذمہ داری کسی بزرگ سے لے کر ان کی طرف منتقل کرنے میں سن کو مدنظر نہیں رکھتا۔ لیکن یہ اللہ کے بندے سن کو سب سے زیادہ اہمیت

[1] الحاکم مستدرك علی الصحیحین ج ۳ ص ۱۲۸

بہ بر یا علمِ انساب پر تیری مہارت دیکھ کر"۔ [1]

اس طرح کی فن کارانہ مہارت دیکھنے کے بعد مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی جب میں نے یہ دیکھا کہ عراق و ایران جنگ کے دَور میں جب انقلابی سرفروشوں کو آلاتِ جنگ کے ساتھ ہی ساتھ عبادات اور ذاتِ پاک بے نیاز سے راز و نیاز جاری رکھنے کی نیت سے مفاتیح الجنان [2] کا ایک نسخہ بھی امام خمینیؒ نے ہر جانباز کو عطا فرمایا تھا اور مجاہدین مورچے پر اس کتاب کی مدد سے دُعا و مناجات میں مشغول ہوتے تھے اور دنیا یہ دیکھ کے حیرت زدہ رہ جاتی تھی کہ جدید اسلحوں کی مدد اور تازہ کمک سے محروم وہ مجاہدین صرف عراق سے ہی نہیں سامراج کی پوری دُنیا سے لوہا لے رہے تھے "مفاتیح الجنان" سے کوئی اور واقف ہو یا نہ ہو لیکن سعودی حکومت سے متعلق بلکہ ان کے انعام و اکرام سے مالا مال افراد بھلا کیسے ناواقف رہ سکتے تھے اس لئے کہ یہ کتاب جس میں قرآن کی سُورتوں اور دعاء و مناجات کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اس کتاب کا داخلہ حدودِ سعودیہ میں ممنوع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے نام سے فائدہ اٹھا کر مولانا نے یہ الزام لگایا کہ امام خمینی محاذ پر جانے والے سُورماؤں کو

---

[1] مروج الذہب و معادن الجوہر ج ۳ ص ۲۲

[2] شیخ عباس قمی کی مرتب کردہ کتاب جو قرآن کے سورتوں اور دعاء و زیارات پر مشتمل ہے اور اس کے سیکڑوں ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

دے رہے ہیں۔

آخر خدا و رسول کے مقابلہ میں اپنی بات کہنے کی کوئی تو وجہ ہوگی۔؟!

پہلی خطائے اجتہادی

تمام سیرت نگاروں اور محدثین کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا تھا کہ: انا معشر الانبیآءِ لا نورث وما ترکنا صدقۃ [1]

ندوی صاحب نے جس طرح اپنی کتاب میں حقائق سے چشم پوشی فرمائی ہے۔ اس کی بڑی واضح مثال موصوف کی یہی عبارت ہے۔ تمام سیرت نگاروں نے کب اور محدثین نے کہاں اس حدیث پر اتفاق کیا؟ روز اول سے یہ حدیث معرض بحث میں ہے جس وقت یہ حدیث حضرت ابوبکر نے پیش کی تھی، اسی وقت جناب سیدہ ؑ نے اسے رد کیا۔ مولائے کائنات علی مرتضیٰ ؑ نے اس پر احتجاج کیا اور اس وقت سے لے کر آج تک حق پسند ہی اس حدیث پر مختلف احتجاج کرتے رہے۔ کیا واقعی انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے اگر یہ ایک مسلمہ ہے تو قرآن کریم کے صریحی احکامات کے خلاف ہے۔ جناب سلیمان ؑ داؤد ؑ کے وارث بنے، جناب ذکریا ؑ نے اپنے

---

[1] السمرتضیٰ ص ۱۳۷

وارث کی تمنّا کی اور جناب یحییٰ کو خود قرآن نے وارث قرار دیا۔ اور اسی طرح متعدد مثالیں موجود ہیں تو کیا قرآن کے واضح اور صریح حکم کے خلاف کسی حدیث کو قبول کیا جا سکتا ہے؟ پھر جس سے متعلق حکم ہو، اُسے خبر کیوں نہیں .....

جناب پیغمبر اسلامؐ کی ایک وارث جناب سیّدہؑ تھیں۔ اگر وہ وارث نہیں ہو سکتی تھیں تو اس کی اطلاع سب سے پہلے جناب فاطمہ زہراؑ کو ملنی چاہیئے تھی۔ رسول اکرمؐ سے روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ انتقال کے بعد پیش آنے والی بہت سی باتوں کا تذکرہ پیغمبر اسلام نے جناب سیّدہؑ سے کیا تھا۔ تو کیا ان باتوں سے زیادہ ضروری بات یہ نہ تھی کہ جناب فاطمہ زہراؑ کو بتا دیا جاتا کہ آپ وارث نہ ہو سکیں گی۔ اور خصائصِ نبوی میں سے یہ بات ہے کہ نبی وارث نہیں بناتے۔ یا یہ بات اتنی عام اور زبان زد ہوتی کہ ہر شخص جانتا ہوتا کہ نبی وارث نہیں بناتا۔ لیکن اس پوری داستان میں کہیں بھی یہ تذکرہ نہیں ملتا۔ جو کم از کم ½ حصّہ کی مالک ہیں ان کو اطلاع بھی نہیں کہ وارث نہیں ہو سکتیں۔ پیغمبر اسلام دوسروں کو تو بتا دیں کہ ہم وارث نہیں بناتے اور خود وارث سے نہیں فرمایا کہ تم میری میراث کی مستحق نہیں ہو گی۔ وہ بھی ایک ایسا مسئلہ کہ جس پہ جناب سیدہ کو احتجاج کرنا پڑا اور علی مرتضیٰ کو دربارِ خلافت میں بحث کرنا پڑی۔!!

اور اس سلسلے میں جناب سیدہؑ نے فرمایا تھا کہ :—

یابن ابی قحافۃ افی کتاب اللہ ان ترث اباک

ولا ارث ابی لقد جئت شیئا فریا

یعنی "اے پسر ابو قحافہ آیا کتاب خدا میں یہی ہے کہ تم اپنے باپ کے وارث ہو اور میں اپنے باپ کی وارث نہیں ہو سکتی؟ یہ تم نے بڑا بہتان باندھا ہے"۔

قرآن میں تو وارث سلیمانؑ داؤد یعنی سلیمانؑ نے داؤدؑ کی میراث پائی حضرت ذکریا کے سلسلے میں قرآن ناقل ہے کہ :—

فَهَبْ لِی مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يرثنی ويرث من

آلِ يعقوب ؕ (سورہ مریم آیت ۵)

یعنی : "اپنے لطفِ خاص سے مجھے ایک فرزند صالح عنایت فرما، جو میرا وارث ہو اور آلِ یعقوب کا وارث ہو"۔

اس موقع پر علامہ محدث دہلوی نے "تحفہ" میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہاں وراثت سے مراد نبوت ہے۔ تو کیا آلِ یعقوبؑ سب کے سب نبی تھے۔ اور اگر واقعی محدث دہلوی کا یہی مقصد ہے کہ الٰہی نمائندگی وارث کے ذریعہ ہوتی ہے تو پھر علیؑ و فاطمہؑ کو اس کا وارث بنا دیا جاتا۔ اور اس طرح وراثت سے علی خلیفہ بلافصل ہو جاتے لیکن صاحبِ تحفہ نے جو اس سلسلے کا جواب دیا ہے اس کی رد خود ندوی صاحب

کر چکے ہیں کہ الٰہی نمائندگی وراثت میں نہیں چلتی" ۱ اور جب نبوت اور الٰہی نمائندگی وراثت میں نہیں چلتی اور یہ سب" برہمنی طریقے" ہیں تو پھر وہ کون سی چیز ہے جس کے وارث یہ لوگ بنے۔ آپ کی اس تحریر کے بموجب وارث اپنا ورثہ بہر حال پائیں گے جیسا کہ بلا کسی تخصیص کے حکم قرآن موجود ہے۔ پھر اس حدیث کے وضع کرنے والے نے بہ ظاہر بغیر غور و فکر کیے ہوئے یہ جملے کہہ دیئے ہیں۔ ورنہ **نحن معاشر الانبیاء** کے بجائے صرف پیغمبر کے لئے واحد متکلم کا صیغہ کہنا چاہیئے تھا کیوں کہ باقی انبیاء کی وراثت تو قرآن سے ثابت ہے اور جو شخص بھی قرآن کی طرف رجوع کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حدیث قرآن سے ٹکرا رہی ہے ___ اور اسی بنا پر جناب سیدہ نے استدلال فرمایا جس کا تذکرہ اکثر علماء اہل سنّت نے کیا ہے جیسے محدث ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری جن کے لئے کہا گیا کہ وہ صاحب علم و ورع و تقویٰ تھے اور اہل سنّت کے اکابر علماء محدثین میں ان کا شمار ہے، اپنی کتاب سقیفہ میں، ابن اثیر نے نہایہ میں، مسعودی نے اخبار الزمان میں اس گفتگو کا تذکرہ کیا ہے اور سب ہی نے مسجد کے اندر مہاجر و انصار کے سامنے مسلمانوں کے مجمع عام میں جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اس تقریر کو

---

۱ المرتضیٰ ص ۱۳۳

اسی طرح نقل کیا ہے اور لانورث کی اس خبر واحد کے مقابلہ میں جناب معصومہؑ کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اگر یہ حدیث درست ہے تو قرآنِ مجید میں انبیاءؑ کی وراثت کی اتنی بہت سی آیتوں کا کیا مطلب ہے؟

اور پھر جنابِ فاطمہ زہراؑ نے فرمایا:۔

افخصکم اللہ بایۃ اخرج ابی منہا ا انتم مخصوص القرآن من ابی وابن عمی۔

یعنی: "آیا خاص طور پر خداوندعالم نے تم پر کوئی ایسی آیت نازل کی ہے جس سے میرے بابا محروم رہے؟ یا تم میرے بابا پیغمبر اسلامؐ اور میرے ابن عم سے زیادہ قرآن کے عام و خاص سے واقف ہو؟"

ظاہر ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حق کو تسلیم کرلیا جاتا مگر تاریخ کچھ اور ہی بتاتی ہے جس کو آپ نے اس انداز سے لکھا ہے کہ:

"حضرت ابوبکر کے لئے ایک سخت آزمائش کا وقت آیا۔ سخت اور انتہائی نازک، سنگین اور جذباتی نوعیت کا جس میں ان کو اپنا فیصلہ صادر کرنا ہے۔ ہر شخص اپنی صوابدید سے جو بات صحیح اور مناسب سمجھتا ہے اس کا مکلّف ہے کہ کس طرح ایک گتھی کو سلجھائے۔ یہاں ایک اصول کا سوال تھا، ایک شرعی مسئلہ تھا جو سیاسی نوعیت بھی رکھتا

تھا اور جذباتی بھی "۔ ؎۱

اب آپ یہ بھی فرما دیجئے کہ شرعی مسئلہ میں اپنی صوابدید سے جو بات مناسب سمجھے کرنے کا اختیار ہے یا حکم شرعی قرآن کی روشنی میں تلاش کرنا لازم ہے ؟

آپ خود فرما رہے ہیں کہ مسئلہ شرعی تھا تو پھر نص قرآن کے ہوتے ہوئے اجتہاد فرمانے کی کیا ضرورت تھی ؟ پھر آگے آپ خود ہی رقمطراز ہیں کہ : ——

"حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: واللہ میں ایسی کوئی بات چھوڑ نہیں سکتا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے"۔ ؎۲

ندوی صاحب پھر فرماتے ہیں :

.... "دوسری طرف حضرت سیدہؑ برابر کا مطالبہ کرتی رہیں، اس کا سبب یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو حضرت ابوبکرؓ کو معلوم تھا اس کا انھیں (جناب سیدہ کو) علم نہ تھا!! یا ان کا خیال ہو گا کہ خلیفۂ رسولؐ کے لئے گنجائش اور جواز اس بات کا ہے کہ وہ ان کی خواہش پوری کر سکیں۔ دونوں اپنی رائے میں مجتہد تھے اور دونوں کے لئے اپنا اپنا عذر تھا اور حق بجانب تھے"۔ ؎۳

؎۱ المرتضیٰ ص ۱۳۹ ؎۲ ایضاً ص ۱۴۱ ؎۳ ایضاً ص ۱۴۲

گویا ندوی صاحب اقرار کر رہے ہیں کہ جس سے متعلق حکم تھا، پیغمبرؐ نے اس تک نہیں پہونچایا اور وراثت سے محرومی کی اطلاع جناب فاطمہ زہراؑ کو پیغمبر اسلامؐ نے نہیں دی، اور جو وارث نہیں تھا اس کو مسئلہ بتا دیا؟

اور حضرت ابوبکر نے یہ تو فرمایا کہ میں وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے۔ تو کیا فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب سیدہ کو نہیں دے دیا تھا اور فتح خیبر کے بعد

لما نزلت وآت ذالقربیٰ حقہ دعا النبی فاطمۃ فاعطاھا فدک الکبیر، اور آت ذی القربیٰ حقہ کی آیت نازل ہوئی تو رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ زہرا کو بلایا اور فدک الکبیر ان کو عطا کر دیا۔ اور جب تک آنحضرتؐ باحیات رہے، فدک جناب فاطمہ زہراؑ کے تصرف میں رہا اور جس کی آمدنی سے جناب سیدہ اپنے گھر کے خرچ کو نکال کر فقراء میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عطا کا تذکرہ در منثور جلد ۴ میں، مولوی علی متقی نے کنز العمال میں اور مسند امام احمد بن حنبل کی کتاب اخلاق کے حاشیہ پر اور جناب حافظ ابی مردویہ واقدی اور حاکم سب ہی نے نقل کیا ہے۔ پھر جس عمل کو پیغمبر اسلام کر چکے تھے اس سے انحراف کس نے کیا اور کیوں؟!!

پھر اولاً یہ مسئلہ وراثت کا تھا بھی نہیں۔ فدک کا مسئلہ پہلے عدالت میں ہبہ کے عنوان سے پیش ہوا تھا۔ جب ہبہ کو تسلیم نہ کیا گیا اور ذوالید سے گواہی طلب کی گئی اور پھر گواہی بھی نہ مانی گئی تب وراثت کی بات آئی تھی کہ اگر اس ہبہ کو عدالت تسلیم نہیں کر رہی ہے تو پھر یہ ملکِ پیغمبرؐ مانی جائے اور جب ملکِ پیغمبرؐ ہے تو وراثت کے عنوان سے بات ہوگی۔

ورنہ شرعی قوانین کے تحت قابض اور متصرف سے گواہی طلب نہیں کی جاتی بلکہ مدعی کی ذمّہ داری ہے کہ وہ ثبوت پیش کرے۔ اسی بنا پر مولائے کائنات علی مرتضیٰ نے دربارِ خلافت میں یہ بات کہی تھی کہ فاطمہ حیات پیغمبر اسلام ہی سے اس کی مالک اور متصرف ہیں۔ ان کے حق سے انھیں کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟

اس وقت جواب ملا تھا کہ یہ مال مسلمانوں کا ہے اگر فاطمہ مکمل شہادت پیش کریں تو یہ ان کی ملک ہے تو میں ضرور ان کو دے دونگا ورنہ محروم کر دوں گا۔

حضرت علیؑ نے اس موقع پر فرمایا تھا: اتحکم فینا بغیر ما تحکم فی المسلمین ؟ آیا تم جو حکم عام مسلمانوں کے سلسلے میں کرتے ہو، ہمارے موقع پر اس کے خلاف کرو گے؟ کیا یہ حکم شرعی پیغمبرؐ نے نہیں بتایا کہ البیّنۃ علی المدعی

والیمین علی من ادعی علیہ۔" اور آپ نے پھر پوچھا
" اگر مسلمانوں کے پاس کوئی چیز ہو اور میں اس کا دعوے دار
ہو جاؤں تو تم کس سے بیّنہ طلب کرو گے ؟"۔ جواب ملا کہ تم سے
تو آپ نے فرمایا کہ " فدک فاطمہ کے قبضے میں ہے اور تم دعویدار ہو
کہ یہ فیئ مسلمین ہے۔ اب تم بیّنہ پیش کرو۔ فاطمہ سے کیوں بینہ اور
گواہی طلب کر رہے ہو۔؟"

یہ بحث سُن کر مجمع میں ایک بے چینی پیدا ہو گئی اور ہر شخص
یہ کہتا ہوا اُٹھا کہ صدق واللہ علی ابن ابی طالب۔" خدا کی قسم!
علی سچ کہہ رہے ہیں۔" [1]

اس کے بعد حضرت عمر اور حضرت ابوبکر بھی اپنے اپنے گھر چلے
گئے لیکن دربار کی بحث نے انھیں اتنا پریشان کر دیا تھا کہ پھر ابوبکر نے
حضرت عمر کو بُلوایا اور کہا کہ آج دربار میں جو کچھ ہوا اگر پھر اس کی تکرار
ہوئی تو کیا ہو گا۔ ہمارا معاملہ تو ختم ہو جائے گا۔ اب آپ کی کیا
رائے ہے۔؟

حضرت عمر نے فرمایا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ ان کے قتل کا حکم
دیا جائے۔ تو پوچھا گیا کہ کون قتل کر سکتا ہے۔ تو کہا گیا:
" خالد بن ولید۔!!"

---

[1] الاحتجاج ص۱۲۳

پھر خالد بن ولید کو بلوایا گیا اور اس کے سپرد یہ امر مہم کیا گیا۔ اس گفتگو کو اسماء بنت عمیس (جو اس وقت زوجۂ ابوبکر تھیں) نے سن لیا اور انھوں نے اپنی کنیز کو مولائے کائنات علی بن ابیطالب کے پاس بھیجا اور کہا کہ میرا سلام کہنا اور یہ آیت پڑھ دینا:

قال یا موسیٰ ان الملاء یعتمرون بک لیقتلوک فاخرج انی لک من النّاصحین ۝[1]

ترجمہ: اور اس نے کہا "اے موسیٰ! اعیانِ حکومت تمھارے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تمھیں قتل کر دیں۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمھارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔"

فدک کا قضیہ

امام المفسرین احمد ثعلبی کشف البیان میں، جلال الدین سیوطی اپنی تفسیر میں، مفسر احمد بن موسیٰ ابو سعید خدری اور حاکم ابوالقاسم حسکانی سے اور شیخ سلیمان بلخی نے ینابیع المودۃ میں تحریر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے فدک جناب سیدہ کو عطا کیا اور وفات رسولؐ تک ان کا قبضہ تھا۔ بعد رسولؐ جب اختیار دوسروں کو حاصل ہوا تو یہ فدک ضبط کر لیا گیا اور کارندوں کو ہٹا دیا گیا

---

[1] سورۂ قصص آیۃ ۲۰

جنّت کی ضمانت دے رہے تھے، ایک ایسی بات ہے کہ مولانا ہی سے سوال کرنا پڑتا ہے کہ

تو ہی بتلا مجھے ظالم اسے کیا کہتے ہیں

ہر چند کہ اگر امام خمینی ایسی معرکہ آرائی میں جس کی حقانیت وللّٰہیت آپ پر متحقق تھی شہید کو جنّت کی ضمانت بھی دیتے تو بے جا نہ ہوتا لیکن بہ طور وقوعہ یہ بات مفروضہ ہے کہ امام خمینیؒ نے ایسی کوئی ضمانت دی ہو، ملاحظہ ہو:

"بیان کیا جاتا ہے کہ ایران و عراق کی جنگ میں امام خمینیؒ نے بھی محاذ جنگ پر جانے والوں کو اس طرح کی ضمانتیں دی ہیں"۔ [1]

خاتمۂ کلام میں بس یہ عرض کرنا ہے کہ یہ پیش کش **الامام** کے عنوان سے بغرض ملاحظہ حاضر ہے۔ یہ "المرتضیٰ" کے کرامات کی سُراغ رسی کا پہلا حصہ ہے۔ توفیقِ الٰہی رفیق رہی اور آپ حضرات نے قدردانی تو دوسرے حصے کی اشاعت میں زیادہ تاخیر نہیں ہوگی۔ دوسرے حصّے میں معنوی اعتبار سے بنیادی چیز وہی ہے جس میں عقیدۂ امامت اور اس کے مالہٗ وما علیہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی عقیدے پر جناب ندوی صاحب نے اپنی کتاب "المرتضیٰ"

---

[1] المرتضیٰ ص ۲۱۹

اس عطا کا ذکر ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ابوسعید خدری کے علاوہ دوسرے مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے۔

توجب ایک چیز ہبہ ہو چکی تھی تو پھر سے وراثت کے باب میں لایا ہی کیوں گیا وجہ ظاہر ہے کہ جب ہبہ سے انکار کیا جائے گا اور گواہی رد کر دی جائے گی تو یہ فئی خود بخود رسولؐ اسلام کی طرف واپس ہو گا پس رسول کریمؐ نے اسے تقسیم نہیں کیا تھا اور اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ اگر تقسیم کیا ہوتا تو پھر کسی اور کا قبضہ ہوتا اور وہ دعویدار ہوتا۔ جب کوئی دوسرا دعویدار نہیں ہوتا یا یہ کہ ملک فاطمہؐ ہے جن کا قبضہ تھا یا ملک رسولؐ ہے اور ان کی وفات کے بعد اسے تقسیم ہونا چاہیے...... اب وراثت سے انکار کے سلسلے میں ندوی صاحب کا کہنا ہے کہ اگر فاطمہ کو محروم کیا تو ابوبکر نے اپنی بیٹی کو بھی تو محروم کیا۔ ایسے جواب کی امید اولاً تو کسی اہل علم اور تاریخ پر نظر رکھنے والے سے نہیں کی جاسکتی۔ ثانیاً اگر یہ جواب دینا ہی تھا تو اس پر نظر رکھی ہوتی کہ انھوں نے بیٹی کو محروم کہاں رکھا وراثت میں مکان ملا جس میں اپنے بابا کو دفن کرایا اور اپنے اسی حق کو امام حسنؑ کی تدفین سے روکنے میں استعمال کیا!!! اگر وراثت نہیں تھی اور تمام مسلمین کا حق تھا تو امام حسنؑ کو بھی وہاں دفن ہو جانے کا حق تھا۔ مگر جناب

عائشہ کے والد تو اسی مکان میں دفن ہوں اور امام حسنؑ نہ ہوں۔ اس کی بنیاد جناب عائشہ کی ملکیت کے دعوے کے علاوہ اور کیا تھی؟

اس موقعہ پر ابن ابی الحدید (جن کو ندوی صاحب بار بار شیعہ اس لیے لکھ رہے ہیں کہ وہ سُنّی ہونے کے باوجود حق کہتے ہیں۔) اپنی شرح میں تحریر کرتے ہیں:

"جب علیؑ و فاطمہؑ کے احتجاج سے لوگ متاثر ہوئے اور سب کی زبان پر یہ آیا کہ حق علیؑ و فاطمہؑ کے ساتھ ہے تو حضرت ابوبکرؓ منبر پر گیے اور یہ فرمایا کہ ایھا الناس تم نے یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگ ہر ایک کی بات پر کان دھرتے ہو۔ چونکہ میں نے ان کی شہادت رد کر دی ہے اس لیے وہ اس طرح کی بات کرتے ہیں۔"

پھر کچھ ایسے گستاخانہ جملے کہے جو اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں کیا "لومڑی اور لومڑی کی دُم" امّ المحال سے مثال دینا یہ سب احترام، محبّت، نُصرت اور ہمدردی کے جُملے تھے۔؟ جن کی تاکید رسُول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمائی تھی!؟ کیا ایسی غیر مہذّب گفتگو دُخترِ رسُولؐ کے سامنے مناسب و جائز

تھی ___ ؟! اگر اس طرح کے جملے سلاطینِ بنی اُمیہ اور بنی عبّاس کی زبان سے نکلتے تو اتنے تعجّب کی بات نہ ہوتی۔ تعجّب تو اس بات پر ہے کہ یہ صحابئ رسُولؐ کہے جانے والے اور خلیفۂ رسُولؐ کہے جانے والے کا اندازِ گفتگو ہے اور وہ بھی مصاحبِ غار۔!!

اور اس واقعہ کے بعد ندوی صاحب کا یہ جملہ بڑا ہی غور طلب ہے کہ :-

"حضرت ابوبکر جس امر پر یقین رکھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے اس پر اٹل رہے اور رسول اللہؐ کی وصیت کو پورا کرنے پر مصر رہے" [۱]

کیونکہ اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی الحدید جلد چہارم ص۸ پر لکھتے ہیں کہ :-

"خلیفۂ وقت کی اس گفتگو سے مجھ کو تعجب ہوا اور میں نے اپنے استاذ ابو یحیٰی سے دریافت کیا کہ ان کلمات میں خلیفہ کا کنایہ اور تعرّض کس کی طرف تھا؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ کنایہ نہیں، صراحت کیساتھ کہا گیا ہے۔ میں نے کہا اگر صراحت ہوتی تو میں

[۱] المرتضیٰ ص۱۴۲

سوال ہی کیوں کرتا ۔

فضحك و قال لعلی بن ابی طالب علیه السّلام قلت: هٰذا الکلام کله لعلی؟ قال نعم انّهٗ المُلك یا بُنیّ!

یعنی وہ ہنس پڑے اور کہا کہ یہ باتیں علی علیہ السّلام کے لئے کہی گئی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سارے الفاظ علی علیہ السّلام کے لیے استعمال ہوئے تو استاد نے کہا ہاں اے فرزند، سلطنت اسی کو کہتے ہیں۔"

—— اب کہیئے ندوی صاحب یہی تعلقات ہیں جس کی آپ مدح و ثنا کر رہے تھے۔ کیا یہ انداز گفتگو وہ بھی بھرے مجمع میں وہ مسند خلافت پر سے مناسب ہے۔؟

جبکہ محمد بن یوسف گنجی شافعی نے کفایت الطالب میں دسویں باب کا عنوان لکھا ہے۔ "البابُ العَاشِر فی کفرِ مَنْ سَبَّ عَلِیًّا۔ (دسواں باب اس شخص کے کفر میں جو علی کو ناسزا کہے) مستدرک میں حاکم نے ہی اس سلسلے کو نقل کیا ہے۔

رہ گئی بات اس حدیث لانورث کی جس کیلیے پیغمبر نے "انا مدینۃ العلم و علی بابھا" اور "انا دار الحکمۃ و علی بابھا" فرمایا "اقضاکم علی بن ابی طالب"، کہا تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جسے اپنے علم کا دروازہ کہہ رہے ہیں۔ ان کی احادیث سے بالخصوص ان احادیث سے جن کا تعلق احکام سے ہو آگاہی رکھتا ہو۔ کیوں کہ اس سے ساری امت کا فائدہ اور نقصان وابستہ ہے اور اگر وہ اگاہ نہ ہو تو اس کے لیے رسولؐ خدا یہ نہ فرمائیں گے۔ کہ "مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ" جو شخص علم حاصل کرنا چاہے وہ علیؑ کے دروازے پر آئے۔ جس کو سب سے زیادہ قضاوت کرنے والا کہا گیا ہو وہ میراث کے اتنے اہم مسئلہ سے ناواقف ہو؟

کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ رسولؐ اللہ تو انھیں علم قضاوت میں سب سے بالاتر قرار دیں اور وہ معاذاللہ وراثت، حقوق کے مسائل سے ناآشنا ہوں اور پیغمبرؐ اسلام ان کو سب کچھ بتائیں اور اپنے گھر کے ایک اہم مسئلہ کو ان سے نہ بتائیں۔ جبکہ قاضی کے علم فقہ اور خصوصاً حقوق، میراث کے مسائل سے واقفیت ضروری ہے۔ اس پر کیسے یقین کرلیا جائے کہ وہ حدیث جس کا تعلق رسولؐ اللہ کے ذاتی اور گھریلو معاملات سے ہو وہ انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وصی کو معلوم نہ ہو جس کے لیے آپ نے فرمایا تھا: وصیی ووارثی یقضی دینی وینجز موعدی علی بن ابی طالب۔ میرا وصی میرا وارث

میرے قرض کا ادا کرنے والا میری باتوں کا پورا کرنے والا علی ابن ابی طالب ہے [1]

خود اس کو میراث کے مسئلہ سے ناواقف رکھا ہو اور اپنی اس خصوصیت کے بارے میں نہ بتایا ہو کہ میری میراث تقسیم نہ ہوگی اور جس بات کو اپنے وصی و وارث سے نہ بتایا ہو اسے اوس بن حدثان یا حضرت ابوبکر نے سن لیا ہو" کیا عقل سلیم یہ بات ماننے پر تیار ہے ایک معمولی سا آدمی جب وصیت کرے اور قابل اطمینان شخص کو اپنا وصی بنائے اور اپنے بعد کے لیے ساری چیزیں کہہ دے لیکن وصیت کا وہ اہم نکتہ،، یعنی پسماندگان کی میراث کا معاملہ نہ بتائے بلکہ ایک غیر شخص سے کہہ جائے کہ میرے بعد یہ ہونا ہے اور یہ نہیں۔

چہ جائیکہ رسول خدا جیسی ہستی جو خاتم الانبیاء بھی ہو اور جس کی غرض بعثت نظام اجتماعی کی حفاظت اور دنیا و آخرت کی آسانیاں فراہم کرنا ہو۔ اپنے لیے وصی و وارث معین کرے یعنی علی کو اپنا وصی و وارث قرار دے اور پھر ایسی حدیث جو خصوصی وعمومی نظم و انتظام کو درہم برہم کر رہی ہو۔ اس وارث کو نہ بتائے جو وصی و وارث ہی نہیں اس کا باب علم بھی ہو!

---

[1] المسند احمد بن حنبل

پھر اپنی بات کو وزنی قرار دینے کے لیے ندوی صاحب رقمطراز ہیں:

"مسند امام احمد بن حنبل میں یہ روایت بھی صحیح ہے کہ سیدہ فاطمہؑ نے فرمایا کہ آپ نے جو کچھ رسولؐ خدا سے سنا ہے اس کو آپ ہی بہتر جانتے ہیں!!![1]

جب کہ ابن واضح اپنی تاریخ میں اس کے برخلاف لکھتے ہیں کہ:۔

"جناب سیدہؑ نے ناراض ہو کر فرمایا کہ تم اپنے باپ کی میراث لو اور میں اپنے باپ کی میراث نہ لوں؟"

اور صحیح بخاری ج ۳ کتاب الخمس حدیث ۲۹۴۶ میں جناب سیدہؑ کی خفگی کا ذکر ہے اور اس حد تک خفگی کہ پھر آپ نے حضرت ابوبکر سے کبھی بات چیت نہیں کی۔ اور جنازہ میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ اور آن جناب کہتے ہیں کہ جناب سیدہؑ نے فرمایا کہ آپ ہی (حضرت ابوبکر) بہتر جانتے ہیں۔

اور پھر آپ ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد چھ ماہ تک حضرت فاطمہ حیات رہیں اور ان کو حضرت ابوبکر سے شکوہ رہا اور اپنے انتقال تک کوئی راہ و رسم نہیں رکھی[2]

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۴۲ [2] ایضاً

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ جب حضرت ابوبکر بہتر جانتے تھے تو پھر عُمر بھر اُن سے خفا کیوں رہیں؟ اور ان سے راہ و رسم کیوں نہ رکھی۔؟

ویسے بزرگ ندوی صاحب کی ذمّہ داری یہ بھی ہے کہ "وارثی" کا مطلب عیاں کریں۔ یہاں وارث سے کیا مطلب ہے ترکہ کی وراثت یا نبوت کی آپ کی حدیث لانورث کے تحت مال و ترکہ کی وراثت تو ہو نہیں سکتی تو کیا نبوت کی وراثت یعنی خلافت مُراد لی جائے۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں؟

فدک کے سلسلے میں ایک بات یہ رہ جاتی ہے کہ جب اسے مولائے کائنات جناب سیدہؑ کا حق سمجھتے تھے تو اپنی خلافت کے زمانے میں فدک کو واپس کیوں نہ کیا۔ یہ سوال امام باقر علیہ السّلام سے بھی کیا گیا تھا۔

سئِل الباقِر لِایّ علۃٍ ترك امیرالمومنین فدك لمّا ولی الناس؟ فقال لاقتداء رسول اللہ لمّا فتح مکۃ وقد باع عقیل دارہ فقیل: الا ترجع الی دارك؟ فقال: ھل ترك عقیل لنا داراً؟

یعنی: امام محمد باقر علیہ السّلام سے سوال کیا گیا کہ امیر المومنینؑ جب خلیفہ

تسلیم کر لئے گئے تو آپ نے فدک واپس کیوں نہ لیا ؟ تو امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاسی کرتے ہوئے کیونکہ فتح مکہ سے پہلے پیغمبر اسلامؐ کا گھر عقیل فروخت کر چکے تھے تو آپ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اپنے گھر جائیں گے ؟ تو آپ نے فرمایا : کیا عقیل نے ہمارے گھر کو چھوڑا ہے ؟ "

فتح مکہ کے بعد جب پیغمبر اسلام کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ اس وقت اگر وہ چاہتے تو اپنا گھر واپس لے سکتے تھے مگر آپ نے اپنی ذاتی چیز کو اہمیت نہ دی بلکہ مسلمانوں کے عام مسائل کو ترجیح دی !

اس کے علاوہ اگر امیر المومنین فدک واپس لیتے تو جس طرح قتل عثمان کے نام پر جمل کی جنگ کھڑی کر دی گئی۔ فدک کی واپسی پر ایک دوسرا ہنگامہ کھڑا کر دیا جاتا اور کہا جاتا کہ دنیاوی املاک کے حصول کی کوشش علی مرتضی کر رہے ہیں پھر مولائے کائناتؑ کو خلافت ظاہری میں سکون ہی کہاں لینے دیا گیا۔ کیسی کیسی خانہ جنگی برپا کی گئی اب اگر فدک لیتے تو غاصبین فدک کے چہرہ سے نقاب بھی الٹ جاتی اور واضح انداز سے ایسے حالات پیدا کیے جاتے جس سے مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہوتا۔ لیکن علیؑ نے صبر کیا

جس کا نتیجہ ہے کہ آج ندوی صاحب بھی یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ

"ہر بات میں اسی امر کو ترجیح دیتے جس میں
اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور بہتری مضمر ہو"

اب اگر علی مرتضیٰؑ فدک واپس لیتے تو وہی فدک جسے صدقہ کہا گیا تھا۔ اور تیسری خلافت میں مروان کی جاگیر بنا دیا گیا۔ اور فدک عملی طور سے بنی امیہؓ کے قبضہ میں تھا تو امیر شام ایک اور شعلہ بھڑکا سکتے تھے۔ اور قتلِ عثمان کے ساتھ ایک اور بہانہ ان کو ہاتھ آجاتا!

اس کے علاوہ رسولؐ اسلام نے خانہ کعبہ کے بارے میں بھی ایک بات کہی تھی جس کی روایت حمیدی نے حضرت عائشہؓ سے کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب عائشہؓ سے فرمایا کہ "اگر تمہاری قوم تازہ مسلمان نہ ہوتی اور مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ ان کے دل پھر جائیں گے تو اس خانہ کعبہ کو گرانے کا ضرور حکم دیتا اور پھر کعبہ کی اصل بنیاد پر اس سے نکالی ہوئی زمین کو شامل کر کے بنواتا اور اس کی چوکھٹ نصب کرتا اور مشرق و مغرب میں اسکے دروازے بنواتا اور اس طرح وہ بنیادِ ابراہیمیؑ کے مطابق ہوتا!

اس تذکرہ کو شبلی نعمانی نے بھی سیرۃ النبی میں بڑی تفصیل

میں فرضی اور قیاسی الزامات کی سنگ باری کی ہے اور شیعوں کے عقیدۂ امامت کیلئے گہر افشانی کی ہے کہ:

"وہ مزاج اُبھر آیا جس کی تہ میں جاہلیت قدیمہ اور ادیانِ محرّفہ کی رُوح کام کر رہی تھی۔"[۱]

دوسری طرف "بیش بہا"، "علمی" "دینی" اور "فقہی" فوائد و نکات پر مشتمل کہکر شاہ اسمٰعیل شہید" کا خط بھی نظر آتا ہے:

"پس آپ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوئی۔ جو آپ کی امامت سرے سے تسلیم ہی نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کر دے وہ باغی اور مستحل الدم ہے اور اس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد اور اس کی بے عزّتی تمام اہل فساد کی طرح خدا کی عین مرضی ہے اس لیے کہ ایسے لوگ بحکم احادیث متواترہ کلاب النّار اور ملعونین اشرار ہیں۔ اس مسئلہ میں اس ضعیف کا بھی مذہب ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب تلوار ہے نہ کہ تحریر و تقریر۔"[۲]!!!

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ:

"ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ فریقِ مقابل (اہل شام) ایک اجتہادی غلطی کا مرتکب تھا اس لئے اس کی تضلیل و تفسیق

---

[۱] المرتضیٰ ص۲۱۳ [۲] سیرت سید احمد شہید ص۵۳۶

سے ذکر کیا ہے کہ :-

"جب پیغمبر اسلام کے زمانے میں قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کرنی چاہی تو چونکہ سامان کافی نہ تھا لہذا ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور حصہ کے گرد چہار دیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہو گا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے یہی حصہ ہے جسے آج حطیم کہتے ہیں اور جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنائی جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں دیوار کعبہ کے ڈھانے سے وہ بدگمان ہو جائیں گے"[1]

تو جب پیغمبر اسلام اپنی خواہش کے باوجود صرف اس لیے خانہ کعبہ کو اس کی اصل بنیادوں پر تعمیر نہیں کرتے کہ مسلمان بدگمان ہو جائیں گے۔ اور حمیدی کی روایت کے مطابق آپ نے مشرق اور مغرب دونوں طرف دروازے صرف اس لیے نہیں بنائے کہ قوم کے دل پھر نہ جائیں تو مولائے کائنات اس

[1] سیرۃ النبیؐ حصہ اوّل ص ۱۶۳

چیز کا اقدام کیسے کرتے جس کا تعلق صرف ان کی ذات اور متعلقین سے تھا۔ اس کو کس طرح وہ برگشتہ قوم برداشت کرتی۔ پھر وہ دنیائے ادنی کے لیے کسی کو اختلاف کا موقع کیوں دیتے۔

خود صاحب معاملہ تھے۔ خاموش رہے لیکن قدرت خدا اور الحق یعلو ولا یُعلیٰ علیہ کا نمونہ دیکھیے کہ جو خلیفہ بنی امیہ میں اعلیٰ درجہ کا خلیفہ شمار کیا جاتا ہے اور جس کی "عدالت" کی بنا پر اس کے ماننے والوں نے "عمر ثانی" کا لقب دیدیا۔ عمر بن عبدالعزیز۔ اس سے اپنے دور خلافت میں فدک کو خاندان نبوت میں ان کا حق سمجھ کر واپس کر دیا اور یقیناً اس اموی خلیفہ نے حدیث "نحن معاشر الانبیاء" کو تسلیم نہ کیا ورنہ ہرگز خاندان نبوت کو فدک واپس نہ کرتا کیونکہ مذکورہ حدیث کو اگر مان لیا جائے تو فدک صدقہ تھا اور صدقہ ان پر حرام تھا شبلی نعمانی بھی لکھ چکے ہیں اور بخاری میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے تو اسے واپس کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صدقہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ اہل بیتؑ اطہار کا حق مان لیا گیا۔ گویا حضرت علی مرتضیٰؑ اور امام حسن مجتبیٰؑ کا فدک کے مسئلہ پر بعد میں خاموش رہنا اور عمر بن عبدالعزیز کا اسے واپس کر دینا اہل بصیرت پر ظاہر کرتا ہے

کہ یہ حق کس کا تھا۔ اور کس نے غصب کیا تھا۔؟ واپسی کا تذکرہ سیرۃ النبی ج ۲ ص ۱۸۷ کے حاشیہ پر مولانا سلیمان ندوی نے یوں تحریر فرمایا ہے "حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باغ فدک سادات کو دیدیا تھا" کاش مولوی سلیمان ندوی صاحب یہ فیصلہ بھی کر دیتے کہ جس حدیث نے فدک کو صدقہ قرار دیا تھا وہ صحیح ہے یا اس صدقہ کا اہل بیتؑ کو واپس کر دینا ؟ کیوں کہ صدقہ تو بہر حال بقول شبلی نعمانی سادات کے لیے ننگ و عار ہے اور ناروا ہے۔ اب اگر فدک واقعی صدقہ تھا۔ تو سادات کو دیا کیوں گیا اور اگر صدقہ عمر بن عبدالعزیز نے نہیں مانا تو اس نے کس بنیاد پر حدیث "نحن معاشر الانبیاء" کو رد کر دیا اور حکم رسولؐ جو بزبان صحابی رسولؐ سامنے آیا تھا اسے نہیں مانا!"

اسی طرح عباسی دور میں مامون نے فدک کے مسئلہ پر جب سوال کیا اور اسے یہ حدیث سنائی گئی مگر اس نے اولاد فاطمہ کو واپس کرنا چاہا۔ تو اگر مولائے کائنات اپنے حق کے لیے اپنے دور خلافت میں خاموش رہے تو صرف اس لیے کہ حق کا بول بالا خود ہو گا۔ اور ہمارا سکوت رنگ لائے گا۔ آج حق کو دبانے والے کل مجبور ہو کر اس کا اقرار کریں گے۔

آغاز قضیۂ سوال بیعت!!!

ندوی صاحب نے بیعت کے سلسلے میں حافظ ابوبکر البہیقی نے جو روایت ابوسعید خدری سے نقل کی ہے۔ اسے تحریر فرمایا ہے۔
حضرت ابوبکر منبر پر چڑھے اور لوگوں پر نظر دوڑائی۔ ان میں حضرت علیؑ کو نہیں پایا تو ان کو بلا کر کہا! اے رسول اللہ کے عم زاد بھائی اور آپ کے داماد کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے؟ حضرت علیؑ نے کہا مجھے کوئی شکایت یا رنجش نہیں اے خلیفہ رسول اللہؐ یہ کہہ کر آپ نے بیعت کرلی۔ یہی الفاظ تھے یا اس کا مفہوم یہی ہے۔[1]

اب ایک دوسری روایت بھی سن لیجئے جسے علامہ حلّی نے اپنی کتاب کشف الحق میں طبری واقدی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ جب علیؑ نے ترک بیعت کی اور حضرت عمر اس بات پر مامور کیے گئے کہ وہ علیؑ کو مجبور کریں تو وہ لکڑیاں لے کر درِ فاطمہؑ پر آئے اس حکایت کو ابن خرابہ کی کتاب غ.ر سے نقل کیا ہے کہ۔

قال زید بن اسلم کنت فمن حمل الحطب مع عمر الی باب فاطمہ حسین امتنع علی و اصحابہ عن البسیعۃ ان یبایعوا فقال عمر لفاطمہ اخرجی من البیت والاّ احرقتہ

---

[1] المرتضیٰ۔ ۱۵

ومن فیہ قال و فی البیت علیؑ و فاطمۃ والحسنؑ والحسین و
جماعۃ من اصحاب النبی فقالت فاطمۃ تحرق علی ولدہ قال ای
واللہ او لیخرجن ولیبایعن میں ان لوگوں میں جو درِ سیدہ پر
لکڑیاں لے کر، عمر کے ساتھ گئے تھے جب علیؑ اور ان کے ساتھیوں
نے بیعت سے انکار کر دیا تھا اور (اس موقعہ پر) حضرت عمر نے جناب
فاطمہؑ سے کہا کہ گھر سے نکل آؤ ورنہ گھر جلا دوں گا اور جو اس میں ہو
اسے بھی ــــــ (راوی کہتا ہے اس موقعہ پر) گھر میں فاطمہ، حسن و
حسین اور اصحاب نبی کی ایک جماعت تھی۔ جنابِ فاطمہؑ نے سوال کیا کہ
میرے بچّوں کو جلا دو گے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم جلا دوں گا۔ ورنہ
باہر نکلیں اور بیعت کریں۔ اس تحریر کے جواب میں فضل بن روزبہان
نے اپنی کتاب ابطال الباطل میں تحریر کر دیا کہ من السمع ما افتراہ
الروافض ھذا الخبر وھو احراق عمر بیت فاطمۃ و ماذکر ان الطبری
ذکرہ فی التاریخ فالطبری من الروافض مشھورٌ بالتشیع حق
ان علماء بغداد ھجروہ نقلوہ فی الرفض التعصب و ھجروا کتبہ
ورواياتہ واخبارہ وکل من نقل ھذا الخبر فلا شک انہ رافضی
متعصب یرید ابداء القدح والطعن علی الاصحاب ومارایا احداً
من ورھذا الا الروافضی ــــــ ینسبوبہ الی الطبری ونحن ماراینا
ھذا فی تاریخہ یعنی روافض نے جو افتراء باندھے ہیں اس میں سب سے

پست و قبیح یہ خبر ہے کہ عمر نے بیت فاطمہ جلایا اور یہ جو (علامہ حلی نے کہا ہے) کہ طبری نے اپنی تاریخ میں اس کو لکھا ہے تو طبری روافض میں سے ہے اور وہ شیعہ مشہور ہے یہاں تک کہ علماء بغداد نے اسے ترک کر دیا اس کی تشیع تعصب کی بناء پر اور اس کی کتابوں اور روایتوں اور اسکی خبروں کو چھوڑ دیا ہے اور جس نے بھی اس خبر کو نقل کیا وہ رافضی ہے اور متعصب ہے اور وہ اصحاب پر طعن و قدح کرنا چاہتا ہے اور ہم نے کسی کو نہیں دیکھا سوائے رافضیوں کے جو اس روایت کو طبری کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ہم نے اس خبر کو تاریخ طبری میں نہیں دیکھا۔ (ابطال الباطل)

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے اور اس کے تضاد و بیانی کو دیکھئے پہلے تو اصل واقعہ سے انکار پھر طبری کو اس روایت کے لکھنے پر رافضی کہہ دیا جس طرح ابن ابی الحدید کو ندوی صاحب بار بار شیعہ لکھ رہے ہیں۔ پھر طبری کو ناقابل اعتبار کہا پھر خود ہی کہا کہ شیعوں کے علاوہ کوئی اس خبر کو طبری کی طرف نسبت نہیں دیتا اور آخر میں گھبراہٹ میں یہ بھی لکھ دیا کہ طبری میں یہ خبر ہم نے نہیں دیکھی۔

تاریخ طبری کے علاوہ شاید یہ بات پیش نظر نہ تھی کہ دوسرے کن بزرگ علماء نے اس خبر کو تحریر کیا ہے۔ اور ہر نقل کرنے والے کو رافضی قرار دے دیا۔ اور طبری کو تو اس کی رافضیت کی بناء پر مقدوح و مجروح قرار دے دیا جن کیلئے ابن خلکان لکھتے ہیں :۔

"ابو جعفر محمد بن جرید بن یزید الطبری صاحب تفسیر الکبیر و التاریخ الشہیر فنون کثیرہ میں امام تھے تفسیر، حدیث فقہ تاریخ وغیرہ پر ان کی کتابیں ہیں اور دوسرے فنون میں ان کی دقیع کتابیں ہیں جو ان کے وسعت علم کو اور غزارت فضل کو ظاہر کرتی ہے ائمہ مجتہدین میں تھے کسی کے مقلّد نہ تھے اور نقل میں ثقہ تھے ان کی تاریخ دوسری تاریخوں کے مقابلہ میں صحیح تر اور ثابت تر ہیں ____

اب ذرا اس خبر کو دیکھ لیجئے کہ طبری نے کس طرح نقل کیا ہے جس کے لئے فضل بن روز بہان کہتے ہیں کہ ہم کو تاریخ میں نظر نہیں آتی ____

حدثنا ابن حمید قال حدثنا جریر عن مغیرہ عن زیاد بن کلیب قال اتی عمر بن خطاب منزل علی وفیہ طلحہ والزبیر ورجال من المھاجرین فقال واللہ لاحرقن علیکم او تخرجن الی البیعۃ۔

ابن حمید اپنے رایوں سے نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"عمر بن خطاب علیؑ کے مکان پر آئے جس میں اس وقت طلحہ، زبیر اور کچھ مہاجرین تھے تو عمر نے کہا خدا کی قسم تم لوگ باہر نکل آؤ اور بیعت کرو ورنہ میں ضرور اس

(تاریخ الامم، الملوک ص ۱۹۸ ج ۳)

گھر کو تم پر جلا دوں گا۔ ان کے علاوہ اس خبر کو امام شہاب الدین جو ابنِ عبد اللہ کے نام شہرت رکھتے ہیں۔ وفات ۳۲۸ھ ہجری عقد الفرید مشہور مورخ ابوالفدا، وفات ۷۳۲ھ ہجری اپنی تاریخ المختصر فی اخبار البشر میں علامہ ابوالولید محمد بن شحنہ روضۃ المناظر میں اور خاص طور سے ابن قتیبہ وفات ۲۷۰ھ اپنی مشہور کتاب الامامت والسیاست میں ج ۱ صـ ۲۰ پر تفصیل سے تحریر کرتے ہیں کہ

"ابوبکر نے ان لوگوں کی خبر دریافت کی جو ان کی بیعت سے تخلف کر کے حضرت علیؑ کے پاس جمع ہوئے تھے۔ اور ان کے پاس عمر بنِ خطاب کو بھیجا

"فدعا بالحطب وقال والذی نفس عمر بیدہ لتخرجن اولاحرقنها علی من فیها فقیل له یا اباحفص ان فیها فاطمہؑ فقال وان" الخ

تو حضرت عمر نے لکڑیاں منگوائیں اور کہا کہ قسم اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں عمر کی جان ہے گھر سے نکل آؤ ورنہ میں آگ لگا دوں گا مع ان لوگوں کے جو اس میں ہیں کسی نے ان کو مخاطب کر کے کہا اے ابو حفص فاطمہؑ بھی ہیں تو انہوں نے کہا ہوا کریں[1]۔!!!

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ

مروج الذہب میں امام ابو الفتح محمد بن عبد الکریم شہرستانی نے اپنی الملل والنحل میں مولوی ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں اس خبر کو صرف دھمکی کے اعتبار سے نقل کرتے ہیں ــــ اور یہی انداز امام ابن عبد البر اپنی کتاب استیعاب میں اختیار کرتے ہیں ــــ مولوی عبد العزیز دہلوی بھی قصد احراق کو تسلیم کرتے ہیں اور اس خبر کو صحیح مانتے ہیں ــــ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ــــ

"دوو گفتن (عمر) اینکہ من می خواہم سوخت پس وجہش آنست کہ ایں تخویف و تہدید کسانی را بود کہ خانہ زہرا را ملجا و پناہ بہر صاحب خیانت دانستہ حکم حرم مکہ معظمہ دادہ درآنجا جمع می شدند و فتنہ و فساد منظور می داشتند"[1]

مولوی وحید الدین صاحب اپنی کتاب حد تحقیق میں ص۱۱ پر اس واقعہ کو یوں لکھتے ہیں کہ ــــ

"جب تک حضرت علیؑ کفن دفن حضرت رسولؐ میں مصروف تھے تو اسی عرصہ میں فرصت پا کر حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنا دیا اور بہ تحکم حضرت علیؑ کو واسطے بیعت کرنے کے طلب کیا ۔ اور رسم تعزیت و ماتم

---

[1] تحفہ ص ۲۹۲

پرسی ساتھ دختر رسول کے کچھ بجا نہیں لائے اور حسب
مضمون ایک روایت تاریخ ابوالفدا...... کے جس پر
کچھ احتمال شیعی ہونے کا نہیں ہو سکتا یہ بات معلوم ہوتی
ہے کہ حضرت عمر واسطے جلانے گھر فاطمہؑ کے ہاتھ میں
آگ لے کر گئے تھے"۔

اور حافظ عبد الرحمان امرتسری نے اپنی کتاب المرتضیٰ المطبوعہ امرتسر صفحہ ۴۰ پر عقد الفرید اور ابو الفدا کی روایت کو مستند مان کر درج کرتے ہیں اور شبلی نعمانی تو اس خبر کو الفاروق میں طبری سے ہی نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ "درایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حضرت عمر کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں ہے۔" ان تمام واضح اور صریح عبارتوں کے بعد اب ذراندوی صاحب کی عبارت پر غور کیجئے کہ۔

"مشہور ہے حضرت علی نے ضرور سمجھا کہ فاطمہ
رضی اللہ عنہا کے احساسات وجذبات کا کسی درجہ لحاظ
کریں اس لئے حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کی۔ پھر
جب فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں تو
حضرت علی نے بر سر عام بیعت کی"۔

ابن کثیر اور دوسرے اہل علم کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ دوسری بیعت

ہرگز درست نہیں[۱]"۔

اس فیصلے اور ایسے 'عقیدہ' پر بحث کی ضرورت ہے۔

آخر میں جناب رئیس آغا صاحب مُدیرِ "عجم" کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے ہفت روزہ میں اس کتاب کا نقشِ اول پیش ہوا۔ اس کتاب کی تسوید سے لے کر ملاحظہ مبارکہ میں پیش ہونے وقت تک بہت سے مہربان ہاتھ دستگیر رہے ہیں۔ نام بہ نام شکرگزاری تو دُشوار ہے مگر میں ان سب کے لئے دُعاگو ہوں۔ لیکن دو نام ایسے ہیں جن کا اظہار ضروری ہے ایک برادر بزرگ، دانشمند محترم چودھری سبط محمد نقوی صاحب جنھوں نے اس کتاب کے مسوّدہ کو دیکھا اور اپنے مشوروں سے مدد پہونچائی۔ دوسرے حسن اختر صاحب جنھوں نے توجہ اور محنت سے کتابت کی۔ خداوند کریم ان حضرات کی سعی کو اپنی راہ میں قبول فرمائے۔ آمین!

(روز ولادت صدیقہ طاہرہؑ)
۲۰ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
۲۵ر نومبر ۱۹۹۴ء

مجتبیٰ علی خاں ادیبُ الہندی
"بیتُ الحمد"
پیر بُخارا، لکھنؤ۔ ۳

۱۔ المرتضیٰ ص ۴۲۹

پہلی بیعت کی توثیق و تجدید تھی صلے ـــــــ

گویا ندوی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ جو روایت ص۱۴۳ پر انہوں نے نقل کی تھی کہ حضرت فاطمہؑ ان سے خوش ہو گئیں تھیں وہ غلط ہے اور جب تک زندہ رہیں، ناخوش رہیں ـــــ اسی لئے علیؑ نے ان کے احساسات کا خیال رکھا۔ اور یہ بھی طے ہو گیا کہ بیعت کی جو بات اتنے زور و شور سے کہی جا رہی ہے اس کی حقیقت کیا ہے ـــــ

"خلافت صدّیق کے اوّل ہی دور میں ایک ایسا آزمائشی مرحلہ پیش آیا جس میں حضرت علیؑ کے طرز عمل نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ وہ خاندانی عصبیت اور سیاسی فکر سے (جو موقعہ سے فائدہ اٹھانا ہے) کوسوں دور اور اخلاص امتیاز کا پیکر تھے۔" ۲

ندوی صاحب اسی سلسلے میں وہ روایت بھی لکھ گئے ہیں جب ابوسفیان نے مدینہ کی گلیوں کو اپنے حامیوں اور مویدین سے بھر دینے کی بات کی تھی ۔ اور مولائے کائنات نے ابوسفیان کی نیت کو سمجھ کر اسے ناکام لوٹا دیا تھا ـــــ

اور پھر اسی سلسلے کی ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جو ابن ابی الحدید کے حوالے سے نقل کی گئی ہے کہ جب فضل بن عباس

ـــــــــــــ

۱،۲ے المرتضیٰ ص۱۵۱

نے کہا بنی تمیم آپ نے ایک نبی کی خلافت حاصل کی ہے (اور وہ نبی ہمارے خاندان کا تھا) تمہارے مقابلے میں ہم (خاندانی طور پر) اس کے زیادہ حقدار ہیں، ابو لہب بن عبد المطلب بن ہاشم کے بعض فرزندوں نے اسی طرح کا کوئی شعر بھی کہا ہے ـــــ

زبیر کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے سُنا تو ان کو بلا کر ان کو روکا اور کہا خبردار! آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا اور فرمایا۔" سلامۃ الدین احبّ الینا من غیرہ"۔ یعنی دین کی بقا ہمیں دوسری باتوں کی بہ نسبت زیادہ عزیز ہے۔[1]

لیکن اس روایت سے جو بات ندوی صاحب کرنا چاہتے تھے وہ ثابت ہو نہ سکی بلکہ معلوم یہ ہوا کہ دین کی بقا دوسری باتوں سے زیادہ عزیز ہے۔ کہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم فی الحال اختلاف نہیں کرنا چاہتے جس سے دین کو نقصان پہونچے گا ورنہ وہ دوسری باتیں جس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہمارا حق غصب ہوا ہے۔

" مگر رسول اللہ نے ہمیں ایک وصیت کی ہے جس پر ہم قائم ہیں"[2]۔ وہ وصیت کیا تھی؟ وہ بھی تو ذکر کیجیے اس لئے کہ حدیث قرطاس سے تو یہی معلوم ہوا تھا کہ پیغمبرؐ وقت آخر جو وصیت کرنا چاہتے تھے اور جس کے لئے آپ نے قلم مانگا تھا وہ وصیت تو نہیں ہو پائی تھی۔ جس کے لئے رسولِؐ اسلام نے

---

[1] (المرتضیٰ ص۱۵۳) [2] (المرتضیٰ ص۱۵۲)

فرمایا تھا کہ میری وصیت کے ذریعہ تم ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہوگے! جس کو صحیح بخاری، صحیح مسلم، حمیدی نے جمع بین الصحیحین میں اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے نقل بھی کیا ہے کہ "ایتونی بدوات وبیاض اکتب لکم کتاباً لن تضلوا بعدی"!!!

شہرستانی نے اپنی کتاب ملل ونحل کے مقدمہ چہارم میں تحریر کیا ہے کہ پہلی مخالفت جو اسلام کے اندر واقع ہوئی وہ رسول اللہ کے حکم سے وصیت لکھنے کے لئے دوات اور کاغذ لانے سے عمر کا منع کرنا تھا ــــــ

رسولِ خدا کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ ہوا ہو کم ہے چنانچہ اسی صدمہ کا ہی نتیجہ تھا کہ حضرت نے برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا تھا اور شاید اس موقع پر وہ وصیت ہوئی جس کا تذکرہ ندوی صاحب کر رہے ہیں جس میں آنحضرتؐ نے مولائے کائنات کو صبر کی تلقین کی اور اسلام کے شیرازے کو بکھرنے سے محفوظ کرنے کے لئے خاموش رہنے کی تاکید تھی ــــ اور اسی لئے مولائے کائنات نے فرمایا تھا کہ

"فصبرت فی العین قذیٰ وفی الحلق شجیٰ"

پس میں نے صبر کیا درانحالیکہ میری آنکھوں میں کھٹک تھی اور گلے میں ہڈی پھنسی ہوئی تھی یعنی صبر کیا مگر گلے سے اترتا نہ تھا ــــ

تاریخ طبری نے اس موقع پر مولائے کائنات کو بلوانے کو تحریر

کیا ہے جس سے پچھلی روایت کی بھی کچھ وضاحت ہو جاتی ہے —

"عن ابی عباس قال قال رسول اللہ ابعثوا الی علی فادعوہ قالت عائشہ لو بعثت الی ابی بکر وقالت حفصہ لو بعثت الی عمر فاجتمعوا عندہ جمیعاً فقال رسول اللہ انصرفوا فان تکن لی حاجتہ أبعث الیکم فانصرفوا" —

ابن عباس کہتے ہیں "اس مرض کے دوران جناب رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ علی کو میرے پاس بلاؤ حضرت عائشہ نے کہا کاش ابو بکر کو بلاتے اور حفصہ نے کہا کاش آپ عمر کو بلاتے اسی درمیان یہ سب لوگ جمع ہو گئے (آنحضرت نے علی کو نہ دیکھا) تو فرمایا، تم لوگ واپس چلے جاؤ اگر مجھے تم سے کوئی ضرورت ہوگی تو بلوالوں گا اور پھر وہ لوگ واپس ہو گئے[1]" —

آنحضرت حضرت علیؑ کو کسی وصیت ہی کے سلسلہ میں بُلانا چاہتے تھے لیکن موقع پر موجود افراد اپنی صواب دید پر دوسروں کو بُلوا رہے تھے لیکن جب آنحضرتؐ نے اپنے حکم کی یہ خلاف ورزی دیکھی تو ان کو واپس کر دیا۔ لیکن ان سے اپنا مدعا بیان نہ کیا پھر بھی حضرت عائشہ

---

[1] تاریخ الامم والملوک

نے اپنے والد کو امامت نماز کے لیے کھڑا کر دیا اور جب مجبور ہو کر حضرت علی کو بلوایا گیا تو اب محدث شیرازی دیکھئے کیا لکھتے ہیں ـــــ

فرمود بخوانید برادر من علی را۔ علی بیامد و بر بالین وے نشست حضرت سر خود از بستر برداشت امیر در شیب بغل وے در آمده سر مبارکش را بر بازوے خویش نہاد آن سرور فرمود اے علی فلاں یہودی پیش من چندیں مبلغ دارد کہ از وے برائے تجہیز لشکر اسامہ قرض گرفتہ و دم زنہار کہ وے را ذمہ من ادا کنی و اے علی تو اول کسی خواہی بود کہ بر لب حوض کوثر بمن رسی و بعد از من بسے امور مکروہ بتو خواہند رسید باید کر تنگ دل نشوی و طریق عصابت پیش گیری و بینی کہ مردم دنیا را اختیار کردند۔ فرماید کہ آخرت را اختیار کنی ـــــ

آنحضرت نے فرمایا کہ میرے بھائی کو بلاؤ۔ حضرت علیؑ آئے اور آپ کے سرہانے بیٹھے آنحضرتؐ نے اپنا سر تکیہ سے اٹھایا اور علی کو اپنی بغل میں لے لیا۔ آنحضرت کا سر علیؑ کے بازو پر تھا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے علیؑ فلاں یہودی سے میں نے لشکر اسامہ کو تیار کرنے کے لئے

قرض لیا تھا اسے ضرور ضرور میری طرف سے ادا کردینا۔
اور اے علی تم پہلے شخص ہو گے جو حوضِ کوثر پر میرے
پاس پہونچو گے۔ میرے بعد تم کو بہت سے مصائب اٹھانا
ہوں گے لیکن تم دل تنگ نہ ہونا بلکہ راہ صبر اختیار
کرنا اور جب دیکھنا کہ لوگوں نے دنیا کو اختیار کرلیا
اس وقت تم آخرت ہی کو اختیار کرنا[1]

شاید یہی وہ وصیت ہے جسے ندوی صاحب ص۱۵۲ پر ذکر کر رہے ہیں۔
اب آپ ہی بتائیے کہ یہ ثبوت مولائے کائنات کے صبر اور اس صبر کے
ساتھ دین اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کا عزم ظاہر کرتا ہے
یا کسی کی تائید و توثیق !!!؟

۱؎ روضۃ الاحباب شیرازی

۶

باب ششم

- حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کا مُبیّنہ تعلق
- حضرت ابوبکرؓ کا اھلِ بیت سے تعلق
- حضرت ابوبکرؓ اور جمع قرآن
- جمع قرآن کی روایت
- سہرا کس کے سر باندھا جائے
- زید بن ثابت
- عقد اُمِّ کلثوم

حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؑ کا مبینّہ تعلق و تعاون

حضرت علیؑ عین اپنی روایتی خاندانی شرافت عالی ظرفی، بے نفسی، عالی نسبی اور بے داغ خلوص و صداقت کے مطابق زندگی بھر حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانے میں ان کے معاون رہے۔ وہ ان کے بہترین مشیر اور سچّے خیر خواہ تھے۔ ہر بات میں اس امر کو ترجیح دیتے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور بہتری مضمر ہو۔"[۱]

ندوی صاحب نے مولائے کائناتؑ کے خاندانی اخلاص، شرافت عالی ظرفی، بے نفسی، عالی نسبی، بے داغ خلوص و صداقت کو حضرت

---

[۱] المرتضیٰ صہ ۱۵۴

الامام

علی المرتضیٰ

علیہ السلام

ابوبکر سے جوڑ دیا بلکہ خود ہی تحریر فرماتے ہیں کہ "ہر بات میں اس امر کو ترجیح دیتے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور بہتری مضمر ہو۔"
مولائے کائنات کا تعاون صرف اور صرف اسلام کی بہبود و بہتری کے لئے ہی تھا ورنہ ان کو خلافت کے انداز اور اس کے طور طریقے پر سخت اعتراض تھا اور اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے۔

جب آپ سے بیعتِ ابوبکر کا سوال حضرت عمر نے کیا تھا اس وقت آپ نے فرمایا تھا: "تم خود میری اطاعت اور بیعت کرو۔"[1]

اور حضرت ابوبکر نے اس موقع پر یہ فرمایا کہ "لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی تو فرمایا تھا کہ میں اپنا جانشین اور خلیفہ کسی کو معین نہیں کرتا تم جسے چاہو خود مقرر کرلینا۔"

اس موقع پر بریدۃ الاسلمی نے احتجاج کیا اور کہا "واللہ یہ غلط ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ہرگز نہیں فرمایا۔"[2]
اور مولائے کائنات نے فرمایا:

"اے ابوبکر! تم غلط کہہ رہے ہو کہ رسول اللہؐ نے یہ فرمایا تھا کہ تم جسے چاہو خلیفہ مقرر کرلینا، بلکہ آپؐ نے میرے ہی بارے میں کہا تھا، کیا تم کو یاد نہیں۔ حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ علی میرا وارث ہے اور میرا وصی ہے اور میرے بعد

---

[1] الامامت والسیاست
[2] ناسخ التواریخ

میری اُمّت کا امام ہے اور ابھی کچھ مُدّت پہلے غدیر کے بھرے مجمع میں تمہارے سامنے یہ فرمایا تھا کہ جس کا میں مولا ہوں اُسکے علی مولا ہیں، اور اس طرح مجھے اپنا جانشین بنایا تھا۔ اور کیا تم کو یاد نہیں کہ میری ہی نسبت آپؐ نے فرمایا تھا کہ علی کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارُونؑ کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی اور اگر اس سے بھی انکار کرو تو اس بات سے بہر حال انکار نہیں کر سکتے کہ تم لوگوں میں مجھ سے زیادہ کوئی آنحضرتؐ سے قریب نہیں تو پھر جس طرح تم نے انصار پر پیغمبرؐ کی قرابت کو اپنے لئے وسیلہ قرار دیکر حجّت تمام کی اور اس قرابت کو دلیل بنا کر خلافت حاصل کی، اب وہی حجّت میں تم لوگوں کے مقابلے میں پیش کرتا ہوں کہ میں تم لوگوں کے مقابلے میں رسُول اللہؐ سے زیادہ قریب ہوں اور تم لوگوں سے زیادہ ہر مصیبت میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام آیا ہوں۔ اور میں نے ہی سب سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی تھی اور تبلیغِ دین میں بھی میں ہی رسُول اللہ کا قوّتِ بازو رہا — تو جس طرح انصار پر تم نے اپنی حجّت تمام کی اور انھوں نے تمہارے ساتھ انصاف کیا، اب تم اس دلیل کو مان کر میری حجّت قبول کرو اور حق سے منھ نہ موڑو اور مجھ سے بیعت طلب کرنے کے بجائے میری بیعت کرو۔

اس گفت گو کو سُن کر ابو عبیدہ بن جراح نے کہا:

"اے علی! جو کچھ آپ نے کہا سچ کہا اور ہمیں آپ کی فضیلت سے انکار نہیں مگر آپ کم سن ہیں اور اکثر عربوں کے قلوب آپ کی طرف سے (آپ کے جہاد کی بنا پر) صاف نہیں ہیں اور ان کی طرف سے آپ کی خلافت پر فتنہ و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور ابو بکر سِن رسیدہ اور تجربہ کار ہیں اس لئے ہم نے ان کی بیعت کر کے ان کو خلیفہ مقرر کر لیا ہے۔ آپ بھی اس بات سے اتفاق کیجئے اور امّت نبی میں تفرقہ نہ ڈالئے۔"

اور مولائے کائناتؑ کی طرف سے اس موقع پر یہ جواب ملا تھا کہ "اے ابو عبیدہ! ایسی بات کہنا جو حق کے منافی ہو، تمھارے لئے مناسب نہیں۔ کم سنی کی جو بات تم نے کہی وہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے بنی اسرائیل نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جناب داؤدؑ سے کہی تھی جب انھوں نے سلیمان کو بحکمِ خدا خلیفہ مقرر کر لیا تھا۔ اے ابو عبیدہ! اپنے حال پر رحم کرو اور جو بات دُرست نہ ہو اسے زبان سے نہ نکالو۔ قرآن ہمارے گھر میں نازل ہوا اور اسکے معنی و مطالب سے ہم واقف ہیں۔ شریعت اور امّت کے مسائل کو ہم دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ جانتے ہیں۔ امر خلافت ہمارے لیے ہے اور ہم اہلِ بیت ہی اس کے حقدار ہیں۔ ملک کا انتظام

اور رعیت کی دیکھ بھال تم ہم سے زیادہ نہیں جانتے۔ خدا اور رسولؐ نے میرے لئے جو کچھ کہا وہ مہمل اور بے موقع نہیں، اور اگر خلافت کو تم نے اپنے قبضے میں کیا تو تم ضرور حق سے تجاوز کرو گے۔"[۱]

اس گفتگو میں خود حضرت ابوبکر بھی شریک ہوئے اور اقرار کرتے ہوئے فرمایا کہ "اے ابوالحسن! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس امر میں اس قدر میری مخالفت اور تنازعہ کرو گے تو میں ہرگز خلافت قبول نہ کرتا۔"

اور اس کا جواب مولائے کائنات نے یہ دیا تھا کہ:

"بلا وجہ حیلہ حوالے سے کام نہ لو اور بہانے نہ تراشو۔ اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ ایک دن تمہیں ان باتوں کا جواب دینا ہوگا۔ اور اس دن کسی کی کچھ نہ چلے گی اور سوائے افسوس کرنے کے کوئی اور راہ نہ ہوگی اور اس موقع پر افسوس بھی کچھ فائدہ نہ پہونچائے گا۔ اے ابوبکر! تم یہ کہتے ہو کہ اگر میں بیعت نہ کروں گا تو گویا میں امن کا شیرازہ بکھیر رہا ہوں حالاں کہ امّت میں انتشار برپا کرنے والے تم لوگ ہو جو حکم خدا و رسول کے خلاف فیصلے کر رہے ہو۔"

یہ واضح مکالمے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مولائے کائنات

---

۱ روضۃ الصفار، روضۃ الاحباب

نے اپنے حق کے لئے صاف صاف بات کرلی تھی البتہ اپنی روایتی شرافت اور عالی ظرفی کی بنا پر وہ انداز نہیں اختیار کر سکتے تھے جو آپ کے دشمن اختیار کیے ہوئے تھے۔ کسی اعلیٰ ظرف کا خاموش ہو جانا اور مشن کے لئے کام کرتے رہنا ہرگز ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ ظالموں اور مخالفین سے خلوص رکھتا ہے۔ بلکہ اس کا خلوص مشن اور دین کی تبلیغ سے وابستہ ہوتا ہے۔

اور یہی بات تھی کہ جب ذوالقصہ جانے کے لئے ابوبکر پابہ رکاب تھے اور مولائے کائنات علی مرتضیٰ ؑ نے روکا تھا وہ صرف اور صرف شوکت اسلام کو باقی رکھنے اور آبروئے اسلام کو بچانے کا مشورہ تھا کیونکہ گزشتہ معرکوں میں جو حالات آپ نے دیکھے تھے اور جانتے تھے کہ اگر کوئی سخت وقت پڑ گیا تو ان کا انداز کیا ہوگا اور اسلام اور مسلمانوں کو کیسی شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ رہ گئی یہ بات کہ معاذاللہ مولائے کائنات کے لئے انتقام کا یہ بہترین موقع تھا اور بقول ندوی صاحب:

"اگر حضرت ابوبکر اور اُن کی خلافت کی طرف سے دل صاف نہ ہوتا اور ان سے علی الرغم بعیت خلافت کی ہوتی تو ان کے لئے یہ سنہرا موقع تھا جس سے باآسانی فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ وہ حضرت ابوبکر کو اپنی حالت پر چھوڑ

دینے، کیا تعجب تھا کہ ان کا رشتۂ حیات ہی منقطع ہو جاتا اور اس قصہ سے تقدیری طور پر چھٹی ہی مل جاتی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ (خاکم بدہن) ممکن تھا (اگر واقعی دل سے حضرت ابو بکر کو ناپسند کرتے اور ان سے گلو خلاصی چاہتے تھے تو) کہ وہ کسی کو اشارہ کر دیتے کہ ان کا (کسی ترکیب سے) کام ہی تمام کر دینا، اور یہ سیاسی ذہن رکھنے والوں اور ناخدا ترس مخالفین کے ہاتھ کا کھیل تھا۔" [1]

مولائے کائنات کے سلسلے میں اس انداز سے سوچنا اور وہ بھی ایک ایسے شخص کا جو بقول خود امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی مفصل سوانح حیات، خاندانی خصوصیات، وہبی کمالات تحریر کرنے جا رہا ہو، واقعی تعجب کی بات ہے۔ کیونکہ مولائے کائنات کی اتنی معرفت تو غیر مسلمین بھی رکھتے ہیں کہ وہ دھوکا دینا اور موقع سے فائدہ اُٹھانا اور غلط مشورہ دینے کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ولی اللہ تھے۔ اور ولی اللہ ہمیشہ حق بولتے ہیں اور دھوکا نہیں دیتے ہیں۔ جس سیاست کا تذکرہ ندوی صاحب اس موقع پر کر رہے ہیں وہ سیاست تو بنی اُمیہ اور بنی عباس کی خصوصیت ہے اسے مولائے کائنات کی زندگی میں کہاں تلاش کرنے لگے۔ ؟ علی مرتضیٰ تو وہ ہیں جو اپنے

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۵۵

قاتل کو بھی پہلے سیراب کرتے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔ یہ گھرانہ کبھی دھوکے میں رکھ کر بات نہیں کرتا ہے۔ اور ان کی اس پاک دامنی کو کسی کی محبّت اور خلوص پر محمول نہ کیجیے۔ پاک دامن ہمیشہ یہی روش اختیار کرتے ہیں۔ اس کا تذکرہ میں کر چکا کہ جب بیعت سے انکار اور فدک کی مدلل بحث سے کوئی ہار گیا تھا تو خالد بن ولید کے ذریعہ قتل کی ایک اور سازش ہوئی تھی جس کی اطلاع اسماء بنت عمیس نے دے دی تھی!!!

ایک غیر مسلم جارج جرداق کہتا ہے کہ علیؑ کی ایک صفت اُنکی پاک نفسی تھی۔ کسی سے کینہ نہیں رکھتے تھے اور اپنے انتہائی سخت اور کینہ توز دشمنوں کے لیے بھی بغض رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔[1]

---

[1] صوت العدالۃ الانسانیۃ

حضرت ابوبکرؓ کا اہلِ بیتؑ سے محبّت و احترام کا تعلق

"سیّدنا ابوبکرؓ کا تعلق اہلِ بیتِ نبویؐ کے افراد و ارکان سے اور خصوصاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دونوں نواسوں حضرت حسنؓ و حسینؓ سے اس درجہ محبّت و شفقت اور احترام کا تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے شایانِ شان اور حضرات کی خصوصیات کے مطابق تھا۔"[1]

یوں تو اہلِ بیتِ اطہارؑ سے اُلفت و محبت بلکہ مودّت رکھنا ہر ایک کے لئے ضروری تھا اور اجرِ رسالت کے طور پر جب یہ مودّت واجب ہوگئی تو ہر مسلمان کے لیے ضروری دلازم ہوگیا کہ وہ اس گھرانے کے تمام افراد سے محبّت دمودّت رکھے۔ اب اگر ابوبکرؓ بھی محبت رکھتے تھے تو یہ اہل بیتؑ پر کوئی احسان تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ وہ ایک فریضہ انجام دے رہے تھے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ تاریخ میں اس کے برعکس حوالے مل رہے ہیں:۔

" اہلِ بیت کی سب سے اہم فرد جنابِ فاطمہؑ کا

---

[1] المرتضیٰ ص ۱۵۷

کوئی پاس ولحاظ نہ رکھا گیا اور ان کو حضرت ابو بکر سے شکوہ رہا، اور انھوں نے اپنے انتقال تک ان سے کوئی راہ و رسم نہ رکھی۔"[۱]

اور ناراض اس دنیا سے تشریف لے گئیں[۲] حضرت علیؑ کے ساتھ جو برتاؤ ہوا وہ ظاہر ہے۔

امام حسنؑ و امام حسین علیہما السّلام اُس وقت کم سِن تھے، ان کے ساتھ جو برتاؤ آپ نے دکھایا ہے وہ اس لیے قابل ذکر نہیں کہ کاندھوں پر خود رسُول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شاہزادوں کو بٹھایا کرتے تھے اب اگر اسی کی ناسپّی میں کسی اور نے اٹھالیا تو کون سی قابلِ ذکر بات ہوگئی، ان سے محبّت والفت ہر شخص رکھتا تھا، یا کم از کم ناسپّی رسُول میں یہ عمل کر کے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔

اور مولائے کائناتؑ کا ہر عمل اسلام کے فائدے کیلئے تھا اور اسی بنا پر خلفاء کی مدد بھی کردیا کرتے تھے اور اپنے حق کے حصُول کیلئے دین کے مفاد کو خطرہ میں نہیں ڈالتے تھے، اور جو نام عرب میں رائج تھے ان کو صرف اس وجہ سے ترک نہ کرتے تھے

۱ے المرتضیٰ ص۱۴۲ ۲ے صواعق محرقہ

کہ خلفاء کے نام ان کے موافق ہیں۔ نہ یہ کہ خلفاء کے نام کی وجہ سے یا اور کسی تعلق کی بنا پر یہ نام رکھے۔ اور محمد بن ابوبکر پر جو شفقت رکھی اس کی بنیاد بھی محمد بن ابوبکر کا ایمان تھا نہ کہ ابوبکر سے کوئی تعلق۔ اور امیر المومنینؑ ہر مومن پر اور صاحب ایمان پر شفقت فرماتے تھے محمدؒ بن ابوبکر چوں کہ اہل بیتؑ کے دوستوں میں سے تھے لہٰذا خلیفۂ اوّلؔ ابوبکر کے فرزند اور امّ المومنین عائشہ کے بھائی ہونے کے باوجود ان کو کبھی خال المومنین نہ لکھا گیا۔ نہ کہا گیا۔ بلکہ جب عمر بن عاص نے مصر فتح کیا تو محمد بن ابوبکر پر پانی بند کر دیا گیا اور سخت پیاس کی حالت میں ان کو قتل کر دیا گیا، اور پھر بھی دل کی پیاس نہ بجھی تو اُنکی لاش کو گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دیا گیا اور دربارِ شام میں ان کی شہادت پر مسرت و شادمانی کا بھی اظہار کیا گیا۔ صرف اِس بنا پر کہ محمد بن ابی بکر مولائے کائناتؑ کے طرفدار تھے اور مخلص شیعوں میں سے تھے اور انھوں نے اہلِ بیتؑ کی شان میں اشعار بھی کہے تھے، ان پر مظالم کی صُورت میں کبھی بھی ان کے والد ابوبکر کا کوئی خیال نہ رکھا گیا بلکہ صرف اور صرف مولائے کائنات علی بن ابی طالبؑ سے لگاؤ و ربط کو دیکھ کر یہ اذیتیں دی گئیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ سمعتُ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول لعلی انا و انت من نور اللہ ۔ (فرائد السمطین)

راوی کہتا ہے کہ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت علیؑ سے فرماتے سُنا ہے کہ "ہم اور تم اللہ کے نُور سے ہیں"۔

○ قال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم النّجوم امان لاھل السماء واھل بیتی امان لامتی ۔ (الصواعق المحرقہ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ستارے اہلِ آسمان کے لئے امان ہیں اور میرے اہلِ بیت میری امّت کے لئے امان ہیں ۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاعلی من احبّک فقد احبنی ۔ (بخاری)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے علیؑ

حضرت ابوبکر اور جمع قرآن

جمع قرآن بھی عجب فضیلت ہے کہ وہ ہر موقع پر ہر شخص کے فضائل میں شمار کر لی جاتی ہے اس موضوع پر "المرتضیٰ" میں حضرت ابوبکر کے ساتھ اس کا ذکر ہے کبھی حضرت عمر کے فضائل میں اور کبھی مصحف عثمانی کے تحت حضرت عثمان کے فضائل میں۔ جب کہ حقیقت امر یہ ہے کہ جمع قرآن کا کام رسولؐ کریم خود پورا کر گئے تھے اور رسول کریم قرآن کو کسی کتاب کے مسودے کی طرح نہیں بلکہ کتاب کی صورت میں چھوڑ گئے تھے۔

رہ گئی بات جمع قرآن کی تو اس سلسلے میں جن روایات پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ تقریباً ۲۲ ہیں جن کا ماخذ صحیح بخاری، کنز العمال اور اتقان ہیں۔ پہلے ان روایات ہی کو دیکھ لیا جائے۔

(۱) ابن ابی شیبہ اپنی اسناد سے علی بن ابی طالبؑ سے نقل کرتے ہوئے کہ سب سے زیادہ اجر والے مصاحف کے لئے ابوبکر ہیں (کیونکہ) ابوبکر پہلے وہ مسلمان ہیں جنھوں نے اسے لوحین کے درمیان کیا۔ ۱۱

۱۱ کنز العمال۔ مسند احمد ج ۲ ص ۴۲

(۲) زید بن ثابت سے روایت ہے کہ ابوبکر نے مجھے اہل یمامہ کی جنگ کے بعد بلوایا۔ عمر بن خطاب ان کے پاس موجود تھے

اور کہا کہ عمر میرے پاس آئے ہیں اور کہا کہ قاریانِ قرآن یمامہ کی جنگ میں قتل ہو گئے ہیں اور خطرہ اس بات کا ہے کہ قرآن ضائع نہ ہو جائے. سوچتا ہوں کہ آپ جمع قرآن کا حکم دیجئے ۔ تو میں نے کہا کہ تم وہ کام کیسے کرو گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ عمر نے کہا: قسم خدا کی یہ کار خیر ہے. اور عمر مسلسل اصرار کرتے اور یاد دہانی کراتے رہے یہاں تک کہ خدا نے شرح صدر عنایت کیا اور میری رائے بھی وہی ہو گئی جو عمر کی رائے ہے ۔ زید کا کہنا ہے کہ ابوبکر نے کہا کہ تم ابھی جوان ہو، ہوشیار ہو۔ یہ کام تمھارے سپرد کرتا ہوں اور تم کاتبانِ وحی میں سے ہو۔ تو تم پتہ لگاؤ اور قرآن جمع کرو۔ پس خدا کی قسم! اگر مجھے کسی پہاڑ کو منتقل کرنے کا حکم دیا جاتا تو میرے لئے اتنا سخت نہ ہوتا جو جمع قرآن کے حکم میں ثقل نظر آیا۔ ——— زید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوبکر سے عرض کیا کہ آپ وہ کام کیسے کریں گے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ تو انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم یہ کار خیر ہے پھر ابوبکر مجھے یاد دہانی کراتے رہے ۔ یہاں تک کہ مجھے شرح صدر عطا ہوا جیسے اللہ نے شرح صدر عمر و ابوبکر کو عطا کیا تھا ۔ تو میں نے تتبع کیا اور قرآن کو مختلف جگہوں سے جمع کیا اور سورہ

توبہ کی آخری آیتیں میں نے خزیمہ انصاری سے لیں، جو اُن کے علاوہ کسی کے پاس نہ تھیں اور یہ قرآن ان کی وفات تک ان کے پاس رہا۔ پھر عُمر کے پاس رہا۔

صحیح بخاری جلد۶ ص۹۸

(۳) ابن شہاب کی روایت جو انس بن مالک سے نقل ہوئی ہے، یوں ہے کہ حذیفہ بن یمانی عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اہلِ عراق کے ساتھ ارمینہ اور آذربائیجان کی فتح میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے اختلاف قرآن کے مسئلہ کو اُٹھایا اور کہا کہ اے امیر المومنین! اس اُمّت کی خبر لیجئے۔ قبل اس کے وہ یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی کتاب میں اختلاف کرنے لگیں۔ تو عثمان نے حفصہ سے کہلایا کہ وہ مصحف روانہ کرو، تاکہ وہ اس کے نسخے بنوا کر واپس کردیں۔ حفصہ نے مصحف روانہ کردیا۔

عثمان نے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاصی عبداللہ بن حرث بن ہشام کے ذریعہ اس کے نسخے تیار کرنے کا حکم دیا (اور ساتھ یہ فیصلہ کردیا کہ) اگر کسی سلسلے میں اختلاف ہو تو قریش کا لہجہ مانا جائے گا اور اگر زید بن ثابت اور حذیفہ میں اختلاف ہو تو لہجۂ قریش کی پیروی کرنا کیوں کہ قرآن قریش کے لہجے میں نازل ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اس طرح چند نسخے

مصحف کے تیار کر لیے تو عثمان نے حفصہ کا قرآن واپس کر دیا۔ اور پھر ہر طرف ان قرآنی نسخوں کو (سرکاری طور پر) بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس نسخہ کے علاوہ جو صحیفہ یا مصحف موجود ہیں وہ نذرِ آتش کر دیئے جائیں۔

ابنِ شہاب کہتے ہیں: "مجھے خارجہ بن ثابت نے خبر دی کہ زید بن ثابت نے سنا تھا کہ سورۃ احزاب کی ایک آیت چھوٹ گئی تھی۔ جب ہم استنساخ کر رہے تھے وہ آیت جو ہم رسول اللہ سے سنا کرتے تھے، تو میں نے اس آیت کی تلاش کی تو وہ آیت خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی۔ ہم نے اُسے سورہ احزاب میں ملحق کر دیا۔"

(آیت نمبر ۲۳) صحیح بخاری ج ۶ ص ۵۹

(۴) ابن شہاب، معالم بن عبداللہ اور خارجہ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک ابوبکر صدیق نے قرآن کو تحریری شکل میں کاغذ پر جمع کیا اور آپ نے زید بن ثابت سے اس پر نظرِ ثانی کرنے کو کہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر ابوبکر نے حضرت عمر سے اس سلسلے میں مدد مانگی تو یہ کام انجام پایا۔ یہ کتاب ابوبکر کے پاس رہی یہاں تک کہ ان کے انتقال کے بعد یہ کتاب حفصہ کے پاس رہی۔ جب عثمان نے اسے طلب کیا تو حفصہ نے

دینے سے انکار کیا۔ پھر جب عثمان نے یہ وعدہ کیا کہ اس کی نقل ہو جانے کے بعد واپس کر دیا جائے گا تو حفصہ نے اسے بھیجا اور نقل کرنے کے بعد عثمان نے یہ کتاب حفصہ کو واپس کر دی۔

(۵) ہشام بن عمرو اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ جب اہلِ یمامہ قتل ہو گئے تو ابو بکر نے عمر بن خطاب اور زید بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جائیں اور لوگوں سے قرآن کی آیات طلب کریں اور جس آیت کی دو افراد گواہی دیں اُسے لکھ لیں۔ یہ کام اس لئے کیا گیا کہ اصحابِ رسولؐ میں سے جن لوگوں نے قرآن جمع کر لیا تھا وہ جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے تھے۔

(۶) محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ جب عمر قتل ہوئے اس وقت تک قرآن جمع نہیں ہوا تھا۔

(۷) حسن کی روایت ہے کہ عمر بن خطاب نے قرآن کی کسی آیت کے لئے پوچھا تو کہا گیا یہ آیت تو فلاں شخص کے پاس تھی جو یمامہ میں قتل ہو گیا تو عمر نے کہا انّا للہ! اور پھر حکم دیا کہ قرآن جمع کر لیا جائے۔ پس جمع کر لیا گیا۔ یہ عمر پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآن جمع کیا۔

(۸) یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب کہتے ہیں کہ جب عمرؓ نے قرآن جمع کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ نے مجمع میں اعلان کیا کہ جس کے پاس قرآن میں سے کچھ ہو لے کر آئے اور لوگوں نے قرآن کاغذ پر، لوح پر اور کھالوں پر لکھ رکھا تھا۔ وہ کسی کی لائی ہوئی آیت کو قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دیتے تھے۔ اور عمرؓ قتل ہو گئے۔ اب عثمانؓ نے یہ کام شروع کیا اور کہا جس کے پاس قرآن میں سے کچھ ہو لے کر آئے اور یہ بھی دو گواہ کے بغیر کچھ قبول نہ کرتے۔

اس موقع پر خزیمہ بن ثابت آئے اور کہا کہ ہم نے دیکھا کہ دو آیتیں تم نے چھوڑ دی ہیں تو پوچھا گیا کہ کون سی دو آیتیں؟ تو خزیمہ نے کہا میں نے رسول اللہ سے سنا تھا لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم الخ تو عثمانؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے لیکن اسے کہاں لکھا جائے؟ خزیمہ نے کہا اسے اس جگہ لکھو جہاں آخری آیات نازل ہوئی ہیں۔ تو یہ آیات سورہ برأت میں تحریر کی گئیں۔

(۹) عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ عمرؓ کوئی آیت قبول نہ کرتے تھے مگر جب دو گواہ گواہی دیتے تھے تو انصار میں سے ایک

شخص آیا اور اس نے یہ دو آیتیں پیش کیں:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ .... الخ

تو عمر نے کہا: میں اس پر گواہی طلب نہ کروں گا کیوں کہ رسول ؐ ایسے ہی تھے۔!!

(١٠) سلیمان ابن ارقم حسن سے اور ابن سیرین زہری کہتے ہیں کہ جب یمامہ کی جنگ میں چار سو قاریان قرآن قتل ہو گئے تو زید بن ثابت عمر بن خطاب سے ملے اور کہا: یہ قرآن ہی باعث ہے جو ہم اپنے دین پر قائم ہیں۔ اگر یہ قرآن چلا گیا تو ہمارا دین بھی رخصت ہو جائے گا۔ اب میں نے عزم کر لیا ہے کہ قرآن جمع کروں کتاب کی صورت میں۔ تو عمر نے کہا، ابھی انتظار کرو۔ میں ابوبکر سے پوچھ لوں۔ پھر یہ ابوبکر کے پاس گئے اور ان سے کہا۔ انھوں نے کہا صبر کرو۔ میں مسلمانوں سے پوچھ لوں۔ پھر انھوں نے ایک اجتماع میں لوگوں کو مخاطب کر کے یہ بات کہی تو سب نے کہا بہت اچھی بات ہے۔ پھر قرآن جمع کیا گیا تو ابوبکر نے اعلان کرا دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ ہو وہ لیکر آئے۔

(١١) خزیمہ بن ثابت کہتے ہیں کہ میں یہ آیت لقد جاءکم رسول من انفسکم الخ لے کر زید اور عمر کے خدمت میں

آیا تو زید نے کہا کہ آپ کے پاس اس آیت کا گواہ کون ہے؟ میں نے کہا، کوئی نہیں۔ تو عمر نے کہا: میں ان کے ساتھ گواہی دیتا ہوں۔

(۱۲) ابو اسحٰق اپنے ساتھیوں سے نقل کرتے ہیں کہ جب عمر قرآن جمع کرنے پر تیار ہوئے تو انھوں نے سوال کیا کہ سب سے بہتر و اعلیٰ عرب کون ہے؟ کہا گیا: سعید بن العاص۔ پھر پوچھا: اور لوگوں میں سب سے اچھا لکھنے والا کون ہے تو کہا گیا زید بن ثابت۔ عمر نے حکم دیا کہ سعید ابن العاص قرآن اکٹھا کریں اور زید بن ثابت لکھیں۔ اس طرح چار مصحف تیار کیے گئے اور انھیں کوفہ، بصرہ اور شام بھیجا گیا اور ایک حجاز میں رکھا گیا۔

(۱۳) عبداللہ بن فضالہ کہتے ہیں کہ جب عمر نے کتاب خدا لکھنے کا کام شروع کیا تو اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو اس کام پر معین کیا کہ جب وہ کسی لفظ پر اختلاف کریں تو قبیلۂ مضر کی بات کو اہمیت دیں کیوں کہ مضر ہی کی اولاد پر قرآن نازل ہوا۔!!

(۱۴) ابو قلابہ کی روایت ہے کہ عہد عثمانی میں جب اساتید اپنے اپنے انداز سے قرآن پڑھا رہے تھے تو شاگرد اس میں

الگ الگ بتائی ہوئی باتوں کی بنا پر اختلاف کرنے لگے۔ جب
یہ بات اساتید تک پہونچی تو وہ ایک دوسرے کو اس کی غلطی
کی بنا پر کافر کہنے لگے۔ یہ خبر عثمان کو ملی تو آپ نے عام مسلمانوں
میں اعلان کیا کہ تم لوگ جب مرکز میں اس طرح اختلاف کر رہے
ہو تو وائے ہو، دور دراز کی جگہوں پر کیا عالم ہوگا۔ اب تم لوگ
مل کر قرآن جمع کرلو۔ اس طرح جمع قرآن کا کام ہوا۔

اب اگر کسی آیت میں اختلاف ہوتا تو اس سے پوچھا
جاتا جس نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہو۔
اس طرح یہ کتاب مکمل ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ اب یہ کتاب
رائج کی جائے اور اس کے علاوہ جو ہمارے پاس ہے اسے ہم
ختم کیے دیتے ہیں تم بھی ختم کردو۔!!

(۱۵) معصب بن سعید روایت کرتے ہیں کہ عثمان خطبہ دے رہے تھے۔
تو فرمایا تمھارے نبیؐ کے زمانے کو تیس سال ہوئے اور تم ابھی
سے قراۃ ابی اور قراۃ عبداللہ کا اختلاف کرنے لگے قسم خدا کی
میں ایسا نہ ہونے دوں گا۔ تم لوگوں کے پاس قرآن کا جو حصّہ
ہو لے کر آؤ۔ اس طرح بہت سی چیزیں جمع ہوگئیں تو
عثمان نے ایک ایک کو بلا کر اس سے پوچھا اور پھر اس طرح
کتاب خدا مرتب کرلی۔ جب اس کام سے فارغ ہوئے تو

پوچھا: تم میں سب سے زیادہ اعلیٰ عرب کون ہے؟ لوگوں نے کہا: سعید بن العاص! پوچھا: اور سب سے اچھا لکھنے والا کون ہے لوگوں نے کہا کہ زید بن ثابت۔ تو عثمان نے کہا کہ سعید اس کتاب کو دُرست کریں اور زید لکھیں۔ لہٰذا زید نے اس کتاب کی کتابت کی اور اسے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ تو میں نے بعض اصحاب کو کہتے سُنا کہ یہ ایک اچھا کام ہوا۔

(۱۶) ابوالملیح کی روایت ہے کہ جب عثمان کتابتِ قرآن پر آمادہ ہوئے تو کہا: تملی هذیل و تکتب ثقیف!

(۱۷) عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر قرشی کہتے ہیں کہ جب کتابِ خدا تیار ہو گئی تو عثمان نے اسے دیکھا اور پسند کیا اور کہا بہت اچھا کام ہوا۔ رہ گیا لہجہ تو عرب اسے خود ٹھیک رکھیں گے۔

(۱۸) عکرمہ کی روایت ہے کہ جب عثمان کے پاس کتابِ خُدا مرتب ہو کر آئی تو اس میں لہجہ میں اختلاف پایا تو کہا اگر ہذیل نے اسے مرتب کیا ہوتا اور ثقیف نے لکھا ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی!

(۱۹) عطا کہتے ہیں کہ جب عثمان نے قرآن کے نسخے تیار کیے تو انھوں نے میرے پاس ابی بن کعب کو بھیجا کہ وہ اِملا کروائیں زید بن ثابت کو اور زید لکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ سعید بن العاص تھے تو یہ مصحف قراۃ ابی بن کعب اور زید پر مشتمل ہے۔

جس نے تم سے محبّت کی اس نے مجھ سے محبّت کی۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حق علیّ علی المسلمین کحق الوالد علی ولدہ (الخوارزمی و الحموینی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ علی کا حق تمام مسلمانوں پر ایسا ہے جس طرح باپ کا حق اپنے بیٹے پر۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لعلی و فاطمۃ و حسن و حسین انا سلمٌ لمن سالمتم و حربٌ لمن حاربتم (ترمذی و ابن ماجہ)

"پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علی و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ سے فرمایا: جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں بھی صلح کروں گا اور جس سے تم جنگ کرو گے اس سے میں بھی جنگ کروں گا۔"

○ قال رسول اللہؐ علی اخیٌ فی الدنیا والاخرۃ۔ (الطبرانی)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ علی دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔

(۲۰) مجاہد کہتے ہیں کہ عثمان نے ابی بن کعب کو حکم دیا کہ وہ قرآن کو بولیں اور زید بن ثابت لکھیں اور اسے درست کریں سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حرث۔

(۲۱) زید بن ثابت کہتے ہیں کہ جب ہم قرآن لکھ رہے تھے تو ایک آیت غائب ہو گئی تھی جس کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سُنا کرتے تھے۔ پھر وہ آیت ہم کو خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی۔ چونکہ حکم رسولؐ سے خزیمہ کی گواہی دوؔ گواہوں کے برابر تھی اس لیے ہم نے ان سے آیت کو لے لیا۔

(۲۲) ابن اشتہ لیث بن سعید سے نقل کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے قرآن جمع کیا وہ ابوبکر ہیں اور زید نے اسے لکھا ہے۔ لوگ زید کے پاس قرآن کی آیت لے کر آتے تھے اور وہ دوؔ گواہیاں لے کر قبول کر لیا کرتے تھے سوائے سورۂ برأت کے آخری حصہ کے جو صرف ابوخزیمہ بن ثابت کے پاس تھا اسے زید نے اس لئے لے لیا کہ ابوخزیمہ کی گواہی پیغمبرؐ اسلام نے دوؔ گواہوں کے برابر قرار دی ہے۔ اور حضرت عمرؓ آیت لے کر آئے تھے اسے زید نے قبول نہیں کیا کیوں کہ اس آیت کے وہ تنہا گواہ تھے۔!!

(الاتقان ج ۱ ص ۱۰۱)

یہ ہیں وہ روایات جو جمع قرآن کے سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں جن میں سے اکثر منتخب، کنز العمال، مسند احمد کے حاشیہ پر مل جائیں گی۔ ج ۲ ص ۴۳ سے ص ۵۲ تک یہ سب خبر واحد ہیں اور پھر ان میں کتنا اختلاف ہے؟

اگر انھیں روایات کو ماخذ بنالیا جائے تو تضاد ہی تضاد ہے کسی سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ عثمان میں یہ کارنامہ انجام دیا گیا کسی سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ ابوبکر میں اور پھر ساتویں اور بائیسویں روایت صریحی طور سے اسی کارنامہ کو حضرت عمر سے منسوب کر رہی ہے۔

اور باقی روایتوں کو چھوڑ کر ابوبکر کے زمانہ ہی کو لے لیا جائے تو کون اس کام کو کر رہا تھا؟ کوئی روایت کہہ رہی ہے زید بن ثابت ذمّہ دار تھے جبکہ چوتھی روایت بتا رہی ہے کہ ابوبکر نے خود ہی یہ کام کیا اور پانچویں روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کام کی ذمّہ داری زید اور عمر نے لے رکھی تھی۔ !!

پھر کیا زید کو یہ کام تفویض کر دیا گیا تھا۔ دوسری روایت میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ کام زید کے سر کر دیا گیا تھا اور پانچویں ہی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اصول دو آدمیوں کی گواہی کا تھا یہاں تک کہ حضرت عمر کی لائی ہوئی آیت اس لیے قبول نہ ہوئی کہ وہ تنہا تھے !!

کیا عثمان کے زمانے تک کتاب کی تدوین نہیں ہوئی تھی، یہ بھی بہت سی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب تیار ہو چکی تھی مگر اس سلسلے میں تیسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے قرآن الگ الگ انداز کے چل رہے تھے اور عثمان نے ان کو محو کرایا، یا نذر آتش کیا۔ اور سرکاری قرآن کے نسخے جاری کیے۔

یہ سرکاری نسخہ جو عثمان نے مرتب کرایا، اس کی بنیاد کیا تھی؟ شروع کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بنیاد وہ نسخہ تھا جو ابوبکر نے تیار کرایا تھا جبکہ آٹھویں اور چودھویں اور پندرھویں روایت تصریح کر رہی ہے کہ بنیاد شہادت عدلین کو قرار دیا گیا تھا، جنھوں نے خود رسُول سے آیت کو سنا ہو۔ پھر ابوبکر سے جمع قرآن کے لئے کس نے کہا تھا۔ شروع کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ عمر نے طلب کیا اور پہلے منع کیا پھر ابوبکر نے قبول کیا۔ پھر زید کو بلایا۔ انھوں نے پہلے انکار کیا پھر قبول کیا۔ لیکن دسویں روایت ظاہر کرتی ہے کہ خود زید اور عُمر نے ابوبکر سے مطالبہ کیا تھا اور انھوں نے مسلمانوں سے مشورہ کے بعد اس کا فیصلہ سُنایا۔

پھر قرآن جمع کرنے کے بعد کس نے مختلف مرکزوں پر اسے بھیجا۔ کوئی روایت کہتی ہے یہ کام عثمان نے انجام دیا۔ کوئی روایت یہ سہرا حضرت عمر کے سر باندھ رہی ہے۔ پھر سُورہ بَرأت کی

آخری آیات اس سورہ سے کب ملحق ہوتی ہیں؟

پہلی، گیارھویں اور بائیسویں روایت سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ ابوبکر میں یہ کام ہوا جبکہ آٹھویں روایت اور باقی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام زمانۂ عمر میں ہوا۔!!

پھر یہ دونوں آیتیں لایا کون تھا؟ تیسری اور ۲۲ ویں روایت بتاتی ہے کہ یہ آیت ابوخزیمہ انصاری لائے تھے اور آٹھویں اور گیارھویں روایت کہتی ہے کہ یہ آیت خزیمہ بن ثابت لائے تھے اور تاریخ کے یہ دو الگ الگ افراد ہیں جن میں آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں۔!! ——— (تفسیر قرطبی ج ۱ ص ۵۶)

اسی طرح پھر کتابت، اِملاء اور تحقیق میں مختلف نام ان روایات میں ملتے ہیں ــــ یہ روایات آپس کے تضاد کے ساتھ اس بات کے بالکل مخالف ہیں کہ قرآن حیاتِ پیغمبرؐ میں ہی جمع کر لیا گیا تھا اور اس کی کتابت بھی ہو گئی تھی، جس کی روایت ابنِ ابی شیبہ، احمد بن حنبل، الترمذی، النّسائی، ابن حبان، الحاکم، البیہقی، الضیاء المقدس ابن عبّاس سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عثمان سے سوال کیا کہ تم نے سورۂ انفال کو سورۂ برات سے کیوں ملا دیا اور اس کے درمیان بسم اللہ بھی نہیں لکھی۔ تو جواب میں عثمان نے کہا: خود پیغمبر اسلامؐ بتایا کرتے تھے اور سورہ آپؐ

ہی نے متعین فرمائے ہیں۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپؐ فرماتے تھے کہ فلاں جگہ لکھ دو۔ کسی دوسری آیت کے لئے فرماتے اسے فلاں جگہ لکھ دو۔ اس طرح سورہ مرتب ہوئے۔ سورہ انفال ابتدا میں مدینہ میں نازل ہوا اور سورہ برأت آخر میں نازل ہوا لیکن دونوں کے واقعات بہت مشابہ تھے، اس لیے مجھے خیال ہوا کہ یہ اس سے متعلق ہے اور میں رسول کریمؐ کے انتقال تک نہیں پوچھ سکا اس لیے میں نے دونوں کو ملا دیا اور اس کے درمیان بسم اللہ بھی نہیں لکھی اور ان دونوں سوروں کو میں نے "سبع طوال" سات بڑے سوروں میں شمار کر لیا۔

——— منتخب، کنز العمال ج ۲ ص ۴۸

طبرانی اور ابن عساکر، شعبی سے نقل کرتے ہیں کہ عہد رسولؐ میں ہی قرآن جمع ہو گیا تھا جو چھ افراد نے کیا تھا: اُبی بن کعب، ابوالدرداء، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، سعد بن عبید، ابو زید اور مجمع بن جاریہ نے اس کی نقل بھی لے لی تھی ــــ سوائے دو یا تین سورتوں کے۔

——— (منتخب کنز العمال ج ۲ ص ۴۸)

قتادہ کی روایت ہے کہ ہم نے انس بن مالک سے جمع قرآن کے لیے سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ عہد نبوی میں ہی چار انصار نے جمع کر لیا تھا: ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابوزید۔

——— (صحیح بخاری ج ۶ ص ۱۰۳)

نسائی نے ایک روایت عبد اللہ بن عمر سے نقل کی ہے کہ "جب قرآن جمع ہوگیا تو میں ہر رات پورے قرآن کی تلاوت کرتا تھا جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا: ایک مہینہ میں پڑھا کرو۔"

(اتقان ج ۱ ص ۱۲۴)

ان روایات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کتاب کی صورت میں زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں آگیا تھا البتہ صرف ۴، ۶ آدمیوں سے ہی کیوں لیا جائے جبکہ اس وقت حفاظ قرآن بہت سے تھے پھر بخاری ہی کی روایات میں کیسا تضاد ہے کہ قرآن عہد رسولؐ میں صرف چار افراد سے لیا جائے۔

پھر یہ بھی کہا جائے کہ قرآن جمع نہیں ہوا تھا ——— پھر اگر حضرت ابوبکر نے یہ فریضہ انجام دے دیا تو کیوں کر حضرت عمر اور زید کو تحقیق کا حکم دیا۔ جب حکم رسولؐ موجود تھا کہ ان چار یا چھ افراد سے قرآن لے لو تو حضرت ابوبکر انھیں سے قرآن لے لیتے، نہ جمع کرنے کی ضرورت نہ گواہی کی ضرورت!!

اور اگر انھیں چار میں ایک زید بن ثابت تھے، اور بقول حضرت ابوبکر وہ جوان، عاقل اور ہوشیار تھے اور رسول اکرمؐ نے ان سے قرآن لینے کو بھی کہا تھا تو پھر صرف ان سے ہی کیوں قرآن

نہ لیا گیا۔ اور ابو خزیمہ یا خزیمہ بن ثابت نے سورۂ برأت کی دو آیتیں ان کو کیسے دے دیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن سے خود پورا قصہ مشکوک ہو جاتا ہے۔!!

اور اگر ان تمام اعتراضات کے باوجود یہ بات مان بھی لی جائے کہ جمع قرآن کا کارنامہ حضرت ابو بکر نے انجام دیا تو پھر کیا یہ قرآن متواتر رہ جائے گا؟ جس قرآن کے لئے آج سارے مسلمان ایک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں کہ وہ یقیناً اللہ کی کتاب ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے اسے کیا بعض لوگ تواتر سے ہٹا کر احاد کی صف میں لانے کی سازش کر رہے ہیں!!؟

وہ قرآن کریم جسے پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود پہونچایا، سب کو سنایا، اپنی حیات ہی میں مرتب کرایا، سوروں کے فوائد، فضائل ذکر کیے، نمازوں اور تلاوت کے لئے اوقات و ایام بتائے، یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود اب جمع قرآن کا سہرا اگر کسی کو باندھنا ہی تھا تو اس انداز سے یہ کوشش ہوتی کہ قرآن پر حرف نہ آتا۔ مگر اس پر بھی غور نہ کیا گیا اور صرف کسی کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے چاہے قرآن پر حرف آجائے اس کی کوئی فکر نہیں!! اگر دو آدمیوں کی گواہی سے قرآن جمع ہوا ہو یا کسی ایک کے کہنے سے دو آیتیں لکھ لی گئی ہوں تو کیا اسے متواتر کہا

جاسکتا ہے؟ اور جب ایک زمانہ ایسا مل جائے جب آیت کا گواہ کوئی ایک یا دو ہوں تو پھر وہ کسی بھی زمانے میں کتنی ہی گواہوں کی گواہوں کی کثرت ہو جائے تواتر کا درجہ نہیں پا سکتا۔!!

عقد اُمِّ کلثومؑ

مولائے کائناتؑ سے خوش گوار تعلقات کے ثبوت میں ندوی صاحب عقد امِ کلثومؑ کا بھی ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔

اہل بیت اطہار کے ساتھ اس گستاخی کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر کو یہ تمنّا تھی کہ خانوادۂ رسالتؐ سے کوئی رشتہ ہو جائے اور شاید اسی لئے پہلے جناب سیّدہؐ کے سلسلہ میں خواستگاری کی گئی تھی اور منفی جواب بھی مل گیا تھا۔ لیکن اس ناکامی کے بعد "چاہنے والوں" نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ "اگر جناب سیّدہؐ سے نہ سہی تو ان کی صاحبزادی جناب امِ کلثوم سے عقد ہوا"۔ جبکہ حقیقت کا اندازہ تاریخ کا کوئی مبتدی طالب علم بھی لگا سکتا ہے کہ یہ واقعہ کب ہوا اور کیسے ممکن ہے؟

اگر حضرت عمر کو خانوادہ رسالت سے وابستگی مقصود تھی تو وہ جناب حفصہ کے توسّط سے پوری ہو چکی تھی۔ روایات کو دیکھئے

تو پتہ چلتا ہے کہ جس امّ کلثوم کا عقد حضرت عمر سے ہوا اس کی عمر ۴، ۵ سال تک تھی [۱]

اور سنہ ۱۷ ہجری میں "چالیس ہزار" درہم حق مہر پر نکاح ہوا [۲]

قضیہ فدک کے سلسلے میں جناب اُم کلثوم کا نام نامی بار بار آیا ہے وہ ام کلثوم سنہ ۱۷ ہجری میں ۴، ۵ سال کی کس طرح ہو سکتی ہیں، جبکہ ان کی مادر گرامی کا انتقال سنہ ۱۱ھ میں ۳ جمادی الثانی کو ہو چکا تھا تو کیا جس شخصیت کا انتقال سنہ ۱۱ھ میں ہوا اس کی بیٹی کی عمر سنہ ۱۷ ہجری میں ۴، ۵ سال ہو سکتی ہے۔؟ اور حضرت عمر تو مہر کی زیادتی پر اکثر ناراض ہوئے بلکہ مہر کم ہونے کے لئے مہر کی حد متعین کرنے پر مصر رہے ہیں پھر خود ہی چالیس ہزار درہم حق مہر رکھ لیا!!

اس عقد کے نتیجے میں ام کلثوم کی اولاد میں صرف دو نام ملتے ہیں: زید اور رقیہ۔ زید کی شہادت معاویہ کے زمانے میں ہوئی اور اسی زمانے میں ام کلثوم کا انتقال ہوا۔ نماز جنازہ ابن عمر اور امام حسن علیہ السلام نے پڑھائی۔ [۳]

---

[۱] ہدایۃ السعداء ص ۲۵۵

[۲] الفاروق: شبلی نعمانی ص ۶۰۳۔ تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۵۴

[۳] تاریخ خمیس۔ روضۃ الاحباب

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انا سیّد ولد آدم و علی سید العرب

(الحاکم)

"پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور علی سردار عرب ہیں"۔

○ قال رسول اللہ انا و علی حجۃ اللہ علی عبادہ۔

(الدیلمی و خطیب بغدادی)

"میں اور علی اللہ کے بندوں پر اللہ کی حجّت ہیں"۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان علیاً ولیکم من بعدی۔ (الدیلمی)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک میرے بعد علی تمہارے ولی ہیں۔

○ قال رسول اللہ ص: عنوان صحیفۃ المؤمن حبّ علی بن ابی طالب (صاحب الفردوس)

فرمایا رسول اکرم ص نے کہ مومن کے صحیفہ کا عنوان محبّتِ علی ابن ابی طالب ہے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یہ بات ذہن میں رہے کہ امام حسن علیہ السلام کی شہادت ۵۰ سنہ ہجری میں ہوئی تو گویا امّ کلثوم زوجۂ حضرت عمر کا انتقال ۵۰ھ سے پہلے ہوا اور اُم کلثوم بنت علی و فاطمہ سنہ ۶۱ھ میں کربلا میں موجود تھیں۔ کربلا سے واپسی پر آپ کے مختلف خطبات اور مرثیے آج بھی موجود ہیں جیسے

مدینة جدنا لا تقبلین
فبالحسرات والاحزان جینا
خرجنا منك والاهلین جمعاً
رجعنا ولا رجال ولا بنینا[1]

اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ام کلثوم جو زید و رقیہ کی ماں ہیں اور جن کا انتقال ۵۰ سنہ ہجری میں ہوا وہ ام کلثوم بنتِ علی و فاطمہ ہرگز نہیں ہیں۔ پھر وہ امِ کلثوم ہیں کون جن کی شادی ۱۷ ہجری میں واقع ہوئی اور اس وقت وہ ۴، ۵ سال کی تھیں۔؟

حضرت ابوبکر کا انتقال سنہ ۱۳ھ میں ہوا[2] اور ان کے انتقال کے بعد ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام

---

[1] روضۃ الاحباب مقتل ابی مخنف
[2] تاریخ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۰۸

امّ کلثوم رکھا گیا[1]

حضرت ابوبکر کی بیوہ جناب اسماء بنت عمیس نے حضرت علیؑ سے عقد کر لیا چنانچہ محمدّ بن ابوبکر کی پرورش اسی وجہ سے حضرت علیؑ کے گھر میں ہوئی اسی طرح امِ کلثوم بنت ابی بکر بھی حضرت علی مرتضیٰ کے گھر ماں کے ساتھ آ گئیں جن کی عمر ۱۷ھ میں ۴، ۵ سال کہی جا سکتی ہے۔ اسی امّ کلثوم کی خواستگاری حضرت عمر نے جناب عائشہ سے کی تھی۔[2]

اور ان کی منظوری کے بعد حضرت عمر نے مناسب سمجھا کہ حضرت علی سے بھی اجازت لی جائے کیوں کہ ام کلثوم حضرت علی کے گھر میں زیر کفالت تھیں اور اس طرح حضرت عمر نے ام کلثوم بنت ابی بکر سے شادی کی جو حضرت علیؑ کے گھر میں پرورش پا رہی تھیں۔ مگر یہ بات واضح رہے کہ وہ بنتِ ابوبکر ہیں بنتِ علی و فاطمہ نہیں۔ مگر "فضیلت کے جویا قلم" بار بار اسے بنتِ علی لکھ کر گویا زبردستی ایک فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جناب ندوی صاحب نے بڑی ہوشیاری سے اس خبر کو صحیح اور

---

[1] تاریخ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۲۰ - الاستیعاب - طبری

[2] " " " ج ۳ ص ۵۴ - الاستیعاب

بزعم خود شیعوں پر حجت تمام کرنے کی غرض سے حوالہ بھی دیا تو ایک شیعہ کتاب مجالس المومنین کا!! لیکن مولانا سے یہ کوتاہی ضرور ہوئی اور وہ یہ بھول گئے کہ یہ "فضیلت" اس لئے ثابت کی جارہی ہے کہ تعلقات میں قربت اور میل ملاپ میں شدت کا ثبوت دیا جائے لیکن جس کتاب کا حوالہ مولانا نے دیا اس کا مطالعہ کرنے والا ہر قاری یہ محسوس کرلیتا ہے کہ اس حوالہ سے تعلقات کی استواری تو دور کی بات ہے شدید اختلافات ظاہر ہوتے ہیں۔ موقع تو یہ تھا کہ شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری کی جس عبارت کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے وہ پوری عبارت نقل کردی جاتی۔ مولانا ندوی صاحب نے اس لئے نقل نہ فرمائی کہ مکمل عبارت ان کے مقصود کے خلاف تھی اور ہم صرف اتحاد اسلامی کی سربلندی کے لئے اس روایت کو نقل کرنے سے مجبور ہیں ورنہ مولانا نے اس موقع پر جو علمی خیانت فرمائی ہے وہ طشت ازبام ہوجاتی۔ پھر بھی ہم مولانا سے ادب کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ اس روایت کو مانتے ہیں اور اگر قبول کرنے پر تیار ہیں تو پھر "تعلقات کی استواری" کے افسانہ کا کیا حشر ہوگا؟ کاش آپ نے اپنی بات کے ضمن میں یہ حوالہ نہ دیا ہوتا[1] ویسے اگر معتبر شیعہ ماخذ کی

---

[1] کیونکہ اس کتاب پر آپ کے پیش رو یہ تبصرہ فرما چکے ہیں کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

کی تلاش ہے تو پھر ملاحظہ ہو:

قال الشیخ مفید رح ان الخبر الوارد بتزویج امیرالمومنین بنته من عمر لم یثبت و طریقه من زبیر بن بکار ولم یکن هو موثوقاً به و کان متهما فیما یذکره من بغضه لامیرالمؤمنین [1]

شیخ مفید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جو روایت حضرت امیرالمومنین کی حضرت عمر سے اپنی بیٹی کی تزویج کے سلسلہ میں وارد ہے وہ ثابت نہیں! کیوں کہ اس کے راویوں میں زبیر بن بکار ہے جو حضرت امیرالمومنین علیہ السّلام سے بغض

(بقیہ حاشیہ) "اسی جنس سے ہے کتاب مجالس المومنین تالیف قاضی نوراللہ شوستری کی جس میں بہت بہت یہ مناقب وغیرہ موجود ہیں۔ ایک شخص علمائے ہرات سے کہ اس کا ہم مذہب تھا اس نے (شہید ثالث سے) بطریق نصیحت کہا کہ اس کتاب میں روایات اور حکایات اور نقل اخبار سے جو کچھ بھرا ہے خلاف واقعہ اور ثقات شیعہ اور سُنی دونوں کے نزدیک بے اصل و باطل ہے نہ کتب تاریخ واخبار میں اصلاً ان کا نشان واثر!!" (تحفہ اثنا عشر باب دوم ص۹۷)

کیا اس گہر افشانی کے بعد مولانا ندوی صاحب شیعوں پر حجت قائم کرنا چاہتے ہیں؟

[1] مراۃ العقول ج ۳ ص ۴۴۹

رکھنے کی بنا پر قابلِ اعتبار نہیں !!

ویسے اس تہمت کا جواب مفصّل مولانا علی حیدر صاحب مرحوم بانی اصلاح کھجوا بہت پہلے واضح انداز سے دے چکے ہیں اور ان کی تحریر مولانا ندوی صاحب سے مخفی نہ ہوگی۔ اب اگر بحث کو چھیڑنا ہی تھا تو پہلے "سر مکتوم فی عقد ام کلثوم" کا مطالعہ فرما لیتے۔

البتہ سہرے کے یہ کاغذی پھول اور تاریخی واقعات کے ساتھ ایسا مزاح کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے قبل اسی طرح رسول اسلام کے دور میں کیا گیا کہ جو بیٹیاں رسول کے گھر میں زیر کفالت تھیں، ان کی شادی جن لوگوں سے ہوئی ان کو اس زمانے میں کسی نے دامادِ پیمبرؐ نہ کہا اور نہ تھے مگر اس خبر کو اتنا عام کر دیا گیا کہ ہر شخص اس کو ایک امر واقعی مانتا اور سمجھتا ہے۔

جبکہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقد جناب خدیجہ سے ۲۵ عام الفیل میں ہوا۔ یعنی بعثت سے ۱۵ سال قبل۔ اور رقیہؓ اور امِ کلثوم کا عقد ابولہب کے بیٹوں سے دس سال قبل اعلانِ نبوت ہوا [۱]

رقیہؓ اور امِ کلثوم کے عقد کے وقت کم از کم عمر اگر ۹ سال تجویز کی جائے جو اعلانِ نبوت سے دس سال قبل ہوا تو اس وقت

---

[۱] اصابہ لابن حجر

تک تو جناب خدیجہ سے پیغمبرؐ کے عقد کو صرف ۵ سال ہوئے تھے یہ بیٹیاں ۹، ۹ سال کی کس طرح ممکن ہیں؟ پھر اعلانِ نبوت کے بعد جب سورۂ تبّت یدا نازل ہوا تو ابو لہب کے کہنے سے دونوں بیٹیوں کی طلاق ہو گئی تو رقیہؓ کا عقد حضرت عثمان سے ہوا اور جب رقیہؓ کا انتقال مدینہ میں ہوا تو ۳ھ ہجری میں اُمّ کلثوم سے عقد ہوا۔[1]

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اُحد کے معرکے میں جب قتلِ رسولؐ کی صدا بلند ہوئی تو جناب فاطمہ زہراؑ بیتاب ہو کر میدانِ جنگ کی طرف گئیں لیکن اس اہم موقع پر گھر میں موجود دوسری بیٹی کے ردّ عمل یا میدان میں جانے کا کوئی ذکر نہیں، جبکہ جناب فاطمہؑ نے باپ کو زخمی حالت میں دیکھا، ان کے چہرے سے خون صاف کیا اور کچھ اشعار بھی اس سلسلے میں موجود ہیں تو دوسری "بیٹی" جو ۳ھ ہجری تک گھر ہی میں رہی وہ "باپ" کے پاس نظر نہیں آئی!!

اسی طرح ہجرت کے بعد جب علی مرتضیٰؑ امانات کی ادائیگی کے بعد "فواطم" کو لے کر مکہ سے روانہ ہوئے اور قبا کے نزدیک پیغمبر سے ملاقات کی وہاں بھی کسی اور کا تذکرہ نہیں۔!!

---

[1] مروج الذہب للمسعودی ص۲۸۸ ج ۲

جناب فاطمہ کے عقد کی پوری تفصیلات کتب میں موجود ہیں۔ خود ندوی صاحب نے بھی "المرتضیٰ" میں کچھ "خاص" باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے لیکن اسی انداز سے باقی بیٹیوں کے عقد کی تفصیلات، خواستگاری، نواسوں کی پیدائش پر پیغمبرؐ کا آجانا وغیرہ کہیں ذکر نہیں۔

ایک طرف حضرت فاطمہؑ کے یہاں اگر ولادت ہوئی تو پیغمبر خود تشریف لاتے ہیں، نام خود رکھتے ہیں، فضائل بیان کرتے ہیں لوگ مبارکباد دیتے ہیں لیکن "دوسری بیٹیوں" کے یہاں نہ جانے کا تذکرہ ہے نہ "نواسوں" کی نام گزاری کے چرچے نہ ہی فضائل کا ذکر!

وہ رسولؐ جو اولاد میں امتیاز نہ برتنے کا حکم دیتا ہو وہی ایک کے دروازے پر چھ مہینے تک سلام کرتا نظر آئے اور دوسروں کے گھر پر جانے کا بھی موقع نہ نکال سکے!!! ایک طرف نواسوں کے فضائل کا انبار، دوسری طرف کوئی ذکر ہی نہیں۔؟!

جناب فاطمہ زہراؐ کے لئے دعا کہ: اللھمّ بارک فیھا و بارک فی نسلھا[1] (خدایا اس کو برکت دے اس پر برکت نازل فرما اور اس کی نسل میں برکت عنایت فرما) کبھی فرمایا "میری نسل فاطمہ کے ذریعہ چلے گی: ان اللہ عز وجل جعل ذریۃ کل نبی فی صلبہ وان

---

[1] الاصابہ ج ۴ صـ۳۶۶

اللہ تعالیٰ جعل ذرّیتی فی صلب علی بن ابی طالب [1]

"بے شک خداوند عالم نے ہر نبی کی ذریت اس کے صلب میں رکھی لیکن خداوند عالم نے میری ذرّیت صلبِ علی میں قرار دی۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں اس بیٹی سے رخصت ہوں اور مدینہ آنے پر سب سے پہلے اسی گھر پر تشریف لائیں اور دوسری بیٹیوں کے یہاں کسی وقت بھی جانے کا تذکرہ نہ ہونا خود بتا رہا ہے کہ دوسری بیٹیاں نہیں ربائب [2] ہیں۔

ویسے اب ایک استدلال ذوالنورین سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ذوالنورین کا مطلب صرف دو بیٹیوں سے شادی تو نہیں بلکہ ذوالنورین کا ایک مطلب ضعیف کر کے سہی یہ بھی تو بیان کیا گیا کہ:

قیل لعثمان "ذوالنورین" لانہ ینتقل من منزل الی منزل فی الجنۃ

---

[1] صواعق محرقہ صد ۱۵۴

[2] وہ لڑکیاں جو زوجہ اپنے ساتھ لائے اور شوہر کے گھر میں پرورش ہو۔

فتبرق له برقتین فلذالك قیل

له ذالك [1]

ترجمہ: "حضرت عثمان کو ذوالنورین اس لئے کہا جاتا ہے کہ جنت میں ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف منتقل ہونگے تو جنّت میں ان کے لیے دو نورانی جگہیں ہوں گی اسلئے ان کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔"

خود بخاری میں ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ اصھار النبیؐ۔ لیکن اس میں ایک بھی حدیث اس داماد کے لئے موجود نہیں ہے۔ جناب سیدہ کے لئے "باب مناقب فاطمہ" بخاری میں موجود ہیں لیکن دوسری بیٹیوں کے لئے پیغمبر کا کوئی فرمان صحیح بخاری میں بھی نقل نہیں ہوا۔

(حصہ اوّل تمام ہوا)

---

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۴۹

مولانا ادیبُ الہندی

کی تازہ تصنیفُ

جدید فارسی ادب پر

انقلابِ اسلامی ایران کے اثرات

دورِ پہلوی کے ثقافتی و سیاسی اوضاع اور اس عہد کے فارسی ادب کا جائزہ۔

بیسویں صدی میں ایران کی مختلف مذہبی و سیاسی تحریکوں کا انتقادی مطالعہ اور ان اسباب و علل کا خصوصی جائزہ جن کی بنا پر انقلاب اسلامی ظہور میں آیا۔

اسلامی جمہوریۂ ایران کے موجودہ حالات کی روشنی میں انقلابِ اسلامی کے مقاصد، مسائل اور امکانات کا تفصیلی مطالعہ۔

ایران میں بعد از انقلاب فارسی ادب کی مختلف اصنافِ سخن کا سیر حاصل انتقادی جائزہ۔

(زیرِ طبع)

Printed at United Block Printers, Lucknow.

الصدّيقون ثلاثة حزقيل من آل فرعون و حبیب النجار و علی ابن ابی طالب و ھو افضلھم ۔ (ابن حجر، ابن عساکر)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: صدیق تین ہیں آلِ فرعون میں سے حزقیل و حبیب النجار اور علی ابن ابی طالب اور یہ (علی) ان تمام میں افضل ہیں۔

○ قال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا علی انت بمنزلة الکعبة۔ (الدیلمی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "اے علی! تمھاری منزلت کعبہ کی طرح ہے"۔

○ قال النبیؐ: انت سیدٌ فی الدنیا و سیدٌ فی الآخرة۔ (الحاکم، الخطیب البغدادی)

نبی کریمؐ نے فرمایا: "(علیؑ) تم دُنیا میں بھی سردار ہو اور آخرت میں بھی"۔

○ نقد تواترة الاخبار ان فاطمة بنت اسد ولدت امیرالمؤمنین علی ابن ابیطالب فی جوف الکعبة (الحاکم)

اخبار متواترہ میں ہے کہ فاطمہ بنت اسد سے امیرالمومنین علی

ابن ابی طالب کی ولادت عین خانہ کعبہ میں ہوئی۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
النظر الی علیٍ عبادہ۔

(الحاکم، احمد بن حنبل)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علی بن ابی طالب کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
یا علی انت قسیم الجنّۃ والنّار

(ابن المغازلی الشافعی)

فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اے علی تم جنت اور جہنّم کے تقسیم کرنے والے ہو۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ذکر علیٍ عبادہ۔ (الخلیلی والقندوزی)

رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "علی کا ذکر عبادت ہے"۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
اولکم وارداً علی الحوض اولکم اسلاماً علی ابن ابی طالب۔ (الحاکم الاستیعاب)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سب سے پہلے میرے پاس حوضِ (کوثر) پر وارد ہونے والے اور تم سے پہلے اسلام کی طرف سبقت کرنے والے علی ہیں"

○ قال رسُول اللہِ صلی اللہُ علیہ وآلہ وسلم انی خلفت فیکم الثقلین ان تمسکتم بھما لن تضلوا ابدًا کتاب اللہ و عترتی اھلُ بیَتی ولن یفترقا حتّٰی یردا علیَّ الحوض۔ (الصواعق المحرقہ)

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑیں جب تک ان دونوں سے متمسک رہو گے کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے وہ کتابِ خدا اور اہلِ بیت ہیں جو کبھی بھی جُدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے۔

○ قال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی مع القرآن والقرآن مع علی لا یفترقا حتّٰی یردا علیّ الحوض (الحاکم والسیوطی)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے
دونوں آپس میں کبھی جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ
میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ
وسلم ان علیاً منی و انا منہ و ھو
ولیّ کلّ مؤمنٍ بعدی۔ (ترمذی و مشکوٰۃ)

فرمایا رسُول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے شک علیؑ
مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں اور (علیؑ) میرے بعد
ہر مومن کے ولی ہیں۔

○ قال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
علی منی و انا منہ ولا یودی عنی الا
انا او علی۔ (مسند احمد بن حنبل)

فرمایا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: علی مجھ سے ہیں
اور میں علی سے ہوں اور کوئی میری جانب سے کچھ نہ پہنچائے گا
سوائے میں خود یا علی۔

○ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
امَرَ بِسدِّ الباب الاّ باب علی۔ (ترمذی)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام لوگوں کے

دروازوں کو (جو مسجدِ نبوی میں کھلتے تھے) بند کرنے کا حکم دیا علاوہ درِ علیؑ کے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا سلمان وصیّ و وارثی و مقضی دینی ومنجز وعدی علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔ (الامام احمد بن حنبل)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ اے سلمان! میرا جانشین و وارث اور میرے قرض کا چکانے والا اور میرے وعدے کو پورا کرنے والا علیؑ ہے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انا مدینۃ العلم و علیٌ بابُھا۔

(ابن حجر۔ الحاکم)

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان اللہ امرنی بحب اربعۃٍ و اخبرنی انہ یحبھم۔ قیل یا رسول اللہ سمھم لنا؟ قال: علی۔ ابوذر۔ مقداد۔ سلمان۔

(الحاکم و ابن حجر)

فرمایا رسولؐ اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ بیشک اللہ نے مجھے چار (حضرات) سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور خبر دی کہ وہ (اللہ) بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ پیغمبرؐ سے عرض کیا گیا کہ ان کے نام تو بتایئے۔ آپؐ نے فرمایا: علیؑ، ابوذر، مقداد، سلمان۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی ابن ابی طالب باب الدین من دخل فیہ کان مومناً ومن خرج منہ کان کافراً۔

(صاحب الفردوس)

فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ علی بن ابی طالبؑ دین کا در ہیں، جو اس در میں داخل ہوگیا وہ مومن ہوگیا اور جو اس در سے خارج ہوگیا وہ کافر ہوگیا۔

○ عن ابی بکرٍ قال لعلی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول لا یجوز احدٌ علی الصراط الا من کتب لہ علی الجواز

(ابن الحجر، والقندوزی)

حضرت ابوبکر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اے علی تمہارے بارے میں فرماتے

ہوئے سنا کہ پل صراط سے کوئی بھی نہیں گزر سکتا مگر وہ جس کو علی نے پروانہ لکھ کر دیا ہوگا۔

○ عن عمر بن خطاب قال رسول الله ﷺ لو اجتمع الناس علیٰ حب علی ابن ابی طالب لما خلق اللہُ النّار۔

(الھمدانی والقندوزی)

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر لوگ علی بن ابی طالب کی محبّت پر جمع ہو جاتے تو خدا جہنم ہی کو خلق نہ کرتا۔

○ عن عائشة قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یا علی حُبُّكَ انّ لیس لِمُحِبّكَ حسرة عند موته ولا وحشة فی قبره ولا فزعٌ یوم القیمة۔

(القندوزی)

جناب عائشہ کہتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اے علی! تمہاری محبّت۔ بے شک تمہارے محب کو موت کے وقت کوئی حسرت نہیں ہوگی اور نہ ہی قبر میں کوئی وحشت اور نہ قیامت کے روز کسی قسم کی گھبراہٹ۔

○ عن ابن عباس قال نزلت فی علی اکثر ثلاثمأۃ آیۃ فی مدحتہ۔ (الطبرانی)

ابن عباس فرماتے ہیں کہ علیؑ کی مدح میں تین سو سے زیادہ آیات نازل ہوئیں۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم النظر الی وجہ علی عبادہ۔

(الحاکم والطبرانی)

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ علی کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لا یحب علیاً منافق ولا یبغضہ مومن

(الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا منافق علی سے محبت نہیں کرے گا اور مومن علی سے عداوت نہیں رکھے گا۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا علی من فارقنی فقد فارق اللہ ومن فارقك یا علی فقد فارقنی۔ (الحاکم)

فرمایا رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یا علی! جس نے

مجھے چھوڑا اس نے خدا کو چھوڑ دیا اور جس نے تمھیں چھوڑا اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من سبّ علیًا فقد سبّنی ومَن سبّنی فقد سبّ اللہ۔ (الحاکم)

فرمایا رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس نے علی کو سبّ وشتم کیا اس نے مجھے سبّ وشتم کیا اور جس نے مجھے سبّ وشتم کیا اس نے اللہ کو سب وشتم کیا۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا علی انت سیّدٌ فی الدنیا وسیدٌ فی الآخرۃ حبیبُك حبیبی وحبیبی حبیب اللہ وعدوُّك عدوّی وعدوی عدوّاللہ والویل لمن یبغضك بعدی. (الحاکم)

فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "اے علی! تم دنیا میں سردار ہو اور آخرت میں بھی، تمھارا دوست میرا دوست ہے اور میرا دوست خدا کا دوست ہے اور تمھارا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دُشمن خُدا کا دشمن ہے اور جو تم سے عداوت رکھے وہ جہنم میں جائے گا۔

عن جابر ابن عبداللہ انصاری اول ثلمةٍ فی الاسلام مخالفۃ علی ۔ (القندوزی)

جابر بن عبداللہ نے فرمایا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا رخنہ علی کی مخالفت کا ہے ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم تکون بین الناس فرقۃ و اختلاف و یکون ھذا و اصحابہ علی الحق.

(الطبرانی ۔ کنزالعمال)

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کے درمیان تفرقہ اور اختلاف ہوگا ۔ اس وقت یہ (علیؑ) اور اس کے چاہنے والے حق پر ہوں گے ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سیکون من بعدی فتنۃٌ فاذا کان ذٰلک فالزموا علی ابن ابی طالب ۔

(کتاب الاصابہ)

فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے بعد فتنہ (اختلاف) ہوں گے اور جب ایسا ہو تو علیؑ کا ساتھ دینا ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
من اتّخذ علیًا امامًا لدینہ فقداستمسك
بالعروۃ الوثقیٰ فی دینہٖ و نفسہ ۔ (الحاکم)

جس (شخص) نے اپنے دین کے لئے علی کو امام مان لیا تو
اس نے اپنے دین اور نفس کے لئے مضبوط رسن سے وابستگی
اختیار کی ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
یاعلی انك ستبتلی بعدی فلا تقاتلنّ
(ابو علی الموصلی)

رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "یا علی تم میرے بعد
عنقریب آزمائش میں ڈالے جاؤ گے تو قتال نہ کرنا۔"

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
من قاتل علیًا علی الخلافۃ فاقتلوہ
کائنًا ماکان ۔ (الدیلمی والقندوزی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو (شخص) خلافت
برعلی سے قتال کرے اس کو قتل کرڈالو چاہے جو بھی ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
حب علیٍ یاکل الذنب کما تاکل

النار الحطب۔ (الدیلمی)

اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا علیؑ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم انا دار الحکمۃ و علیٌ بابھا۔ (الترمذی، الحموینی)

فرمایا رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم حبّ علی حسنۃ لا تضر معھا سیئۃ و بغضہ سیئۃ لا تنفع معھا حسنۃ

(القندوری)

فرمایا رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ علی کی محبت ایسی نیکی ہے جس کی وجہ سے بدی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور علیؑ سے عداوت کرنا ایسی برائی ہے جس کے سبب نیکی فائدہ نہیں دے گی۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم لکل نبی وصیٌ و وارث و ان علیاً وصیّ و وارثی (صاحب الفردوس)

فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ ہر نبی کا وصی و وارث ہوتا ہے اور بے شک علی میرے وصی و وارث ہیں۔

علی امام البررة و قاتل الفجرة منصورٌ من نصره و مخذولٌ من خزله۔

(الحاکم والسیوطی)

علیؑ نیکوں کے امام اور فاجروں کے قتل کرنے والے ہیں جو آپ کی مدد کرے اس کی مدد کرتے ہیں اور جو آپ کو ذلیل کرنا چاہے اس کو ذلیل کرنے والے ہیں۔

علی خیر البشر فمن ابیٰ فقد کفر

(الخطیب البغدادی)

علی خیر البشر ہیں پس جس نے اس کا انکار کیا وہ کافر ہوا۔

قال علی علیہ السلام علمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الف باب من العلم واستنبطت من کل بابٍ الف باب

(فخر الدین الرازی)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کے ایک ہزار باب تعلیم کیے اور میں نے ہر باب سے ہزار ہزار باب کا استنباط کیا۔

ماکان احدٌ من الناس یقول سلونی غیر علی بن ابی طالب علیہ السلام ۔ (الاستیعاب)

لوگوں میں سے کوئی بھی علی علیہ السلام کے علاوہ ایسا نہ تھا جو دعوائے سلونی کرتا۔

قال رسول اللہ صلی اللہُ علیہ و آلہ وسلم ان ھٰذا اخی وصیی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ و اطیعوا۔ (الطبری)

بے شک یہ (علی) تمہارے درمیان میرا بھائی و وصی اور میرا خلیفہ ہے پس اس کی باتوں کو سنو اور اطاعت کرو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اول من صلی معی علی بن ابی طالب۔ (الحاکم)

جس نے سب سے پہلے میرے ہمراہ نماز پڑھی وہ علی ہیں۔

دفع النّبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم الرایۃ یوم بدر الی علی وھو ابن عشرین سنۃً۔ (البدایہ والنہایہ)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزِ بدر علیؑ کو علم دیا جبکہ آپ کی عمر بیس سال تھی۔

○ كان الذى قتل اصحاب اللوا على

(كامل ابن اثير)

جس نے اصحاب لوا (کفر کے پرچم والوں) کو قتل کیا وہ علی ابن ابی طالب ہیں۔

○ وكان على ممّن ثبت مع رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم يوم احد حين انهزم الناس۔ (طبقات ابن سعد)

اُحد کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہنے والے علیؑ ہیں جبکہ لوگ فرار اختیار کر رہے تھے۔

○ (و فى احد) لاسيف الّا ذوالفقار و لا فتىٰ الّا على۔ (تاریخ کامل ابن اثیر)

(اُحد کے روز) یہ آواز سُنائی دی: ذُوالفقار جیسی کوئی تلوار نہیں اور علیؑ جیسا کوئی جوان نہیں۔

○ قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ضربة على يوم الخندق افضل من عبادة الثقلين۔ (الحاکم)

فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کے روز

علیؑ کی ضربت دو جہاں کی عبادت سے افضل ہے۔

○ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم علی ابن ابی طالب لقتال الناکثین و القاسطین و المارقین۔ (الحاکم)

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو ناکثین و قاسطین و مارقین کے ساتھ قتال کرنے کا حکم دیا۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم علی مع الحق و الحق مع علی ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض یوم القیمۃ۔ (الحافظ الہیثمی)

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علی کے ساتھ ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن یہ دونوں حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے۔

○ کان اوّل من سجد للہ شکراً و اوّل من وضع وجھہ علی الارض بعد سجدتہٖ۔ (مناقب)

(علی) نے سب سے قبل سجدۂ شکر ادا کیا اور سب سے پہلے سجدے کے بعد اپنا چہرہ زمین پر رکھا۔

○ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم لاعطین الرایۃ غدًا رجلاً یفتح علی یدہ یحب اللّٰہ و رسولہ ویحبہ اللّٰہ و رسولہ۔ (البخاری والمسلم)

فرمایا رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کل میں علَم اس کو دوں گا جو مرد ہو گا۔ (اللہ) اس کو کامیابی عطا کرے گا وہ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہو گا اور اللہ و رسول بھی اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔

○ عن علی کرّم اللّٰہ وجہٗ قال کنت امشی مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم فاتینا علی حدیقۃٍ فاعتنقنی اجحش باکیًا فقلت ما یبکیک یا رسول اللّٰہ؟ فقال ابکی لضغائن فی صدور قوم لا یبدونھا لک الا بعدی، فقلتُ من سلامۃ من دینی؟ فقال فی سلامۃ من دینک۔

(الخوارزمی والحموینی)

حضرت علی کرّم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں کہ میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہمراہ چلتے ہوئے باغ میں آیا۔ آپؐ نے مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے شدّت سے رونا شروع کر دیا میں نے پوچھا اے خدا کے رسُولؐ! آپ کو کس چیز نے رُلایا۔؟ آنحضرتؐ نے فرمایا میں لوگوں کے بُغض و کینے کے لیے رو رہا ہوں جو میرے بعد تم سے کریں گے۔ میں نے پوچھا: میرا دین تو سلامت رہے گا آنحضرتؐ نے فرمایا: ہاں تمہارا دین سلامت رہے گا۔

○ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کان یمرُّ بباب فاطمۃ اذا خرج الی صلاۃ الفجر یقول یا اھل البیت یرحمکم اللہ ثلاثۃ مرّتٍ ستّۃ اشھُرٍ

—— الامام احمد بن حنبل

بے شک رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز صبح کیلئے جاتے تھے تو فاطمہ زہرا علیہا السلام کے دروازے پر جاکر تین بار کہتے تھے اے اہل بیت خدا تم پر رحمت فرمائے۔ آپ کا یہ عمل چھ ماہ تک رہا۔

○ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْم ط عن

جعفر الصادق علیه السّلام قال النعیم ولایة علیؑ بن ابی طالب

—— ابونعیم الحافظ

لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ط کی تفسیر بتاتے ہوئے امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا کہ نعمت سے مراد علی ابن ابی طالب علیہ السّلام کی ولایت ہے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا بریدۃ ان علیًا ولیکم من بعدی۔

—— (الدیلمی)

حضرت رسُول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا اے بریدہ! بے شک علی میرے بعد تمہارے ولی ہیں۔

○ قال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من لم یقل علی خیر الناس فقد کفر۔

—— الخطیب البغدادی۔ متقی الھندی

رسُول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو (شخص) بھی یہ نہ کہے کہ علی خیر مردم ہیں تو وہ کافر ہوگیا۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلم امّتی من بعدی علی بن

ابی طالب۔ ـــــــــــ (الدیلمی، الخوارزمی)

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد میری امّت کے اعلم علی ابن ابی طالب ہیں۔

○ قال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لو ان الریاض اقلام والبحر مداد والجن حساب والانس کتاب ما احصوا فضائل علی بن ابی طالب۔

ـــــــــــ (صاحب الفردوس ابنِ طلحہ شافعی)

رسُول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تمام درخت قلم اور تمام سمندر روشنائی بن جائیں اور تمام جنّ حساب کرنے والے اور تمام لوگ لکھنے والے، تب بھی فضائِل علی علیہ السلام کا احاطہ نہیں کرسکتے۔

○ قال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ غیر انہ لا نبی بعدی۔

ـــــــــــ (الصواعق المحرقہ)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمھاری مجھ سے وہی نسبت ہے

جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے ہے سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان علی بن ابی طالب امام امّتی و خلیفتی علیھا من بعدی و من ولدہ (القائم) المنتظر الذی یملأ بہ الارض قسطاً و عدلاً کما ملئت جوراً و ظلماً. والذی بعثنی باالحق بشیراً وّ نذیراً اِنّ الثابتین علی القول بامامتہ فی زمان غیبتہ لاعز من الکبریت الاحمر فقام الیہ جابر بن عبداللہ الانصاری فقال یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) و للقائم من ولدک غیبۃٌ؟ قال (ص) ای و ربی (لیمحص اللہ الذین آمنوا و یمحق الکٰفرین) یا جابر ان ھذا لامر من امر اللہ و سرٌ من سر اللہ من سر علتہ مطویۃٌ عن عبادہ، فایاک والشک۔ فان

الشك فی امر الله عزّ وجلّ كفرٌ

(الحموینی)

پیغمبر اسلام صلّے اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یقیناً علی بن ابی طالب میرے بعد میری اُمّت کے امام اور میرے خلیفہ ہیں اور ان کی اولاد میں سے قائمُ المنتظر جس کے ذریعہ (خُدا) زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جَور سے بھر چکی ہوگی، اور اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق پر مبعوث کیا، بشیر اور نذیر بنایا یقیناً اس کی غَیبت کے زمانے میں جو اس کی امامت پر ثابت قدم رہیں گے وہ میرے نزدیک کیمیا سے بھی زیادہ عزیز ہوں گے (یہ سن کر) جابر بن عبداللّٰہ انصاری کھڑے ہو کر بولے: کیا آپ کے فرزند قائمُ کو غیبت ہوگی؟ پیغمبر اسلام صلے اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پروردگار کی قسم! ایسا ہی ہوگا۔ (لیمحص الله الذین آمنوا ویمحق الکافرین) اے جابر! یہ امر خدا میں سے ایک امر ہے اور اس کے اسرار میں سے ایک راز ہے جو کہ بندوں سے پوشیدہ ہے۔ خبردار! شک نہ کرنا۔ یقیناً امر الٰہی میں شک کرنا کُفر ہے۔

○ قال رسُول الله صلی الله علیه و آله وسلم

یا ایہا الناس ان اللہ مولیٰ و انا مولی المؤمنین و انا اولیٰ بہم من انفسہم فمن کنت مولاہ فھذا علیٌ مولاہٗ اللھم وال من والاہٗ وعاد من عاداہٗ۔

(ابن الحجر العسقلانی)

نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ میرا مولیٰ ہے اور میں مومنین کا مولیٰ ہوں اور ان کے نفسوں پہ ان سے زیادہ حق تصرّف رکھتا ہوں۔ پس جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولیٰ ہیں۔ پروردگار! اس کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو علیؑ کو دشمن رکھے۔

○ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم لعلی من اشقی الاوّلین قال عاقر الناقۃ قال فمن اشقی الآخرین قال اللہ و رسولہ اعلم قال قاتلک

(الخطیب البغدادی)

پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ

ابنِ ابی طالب علیہ السّلام سے فرمایا: اوّلین میں شقی ترین شخص کون ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا: جس نے ناقۂ صالحؑ کو ذبح کیا. پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سوال کیا: آخرین میں شقی ترین کون ہے؟ حضرت علیؑ نے جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں. آپؐ نے فرمایا: تمہارا قاتل!

۱

باب اوّل

○ حضرت علی کی ولادت

○ مستدرک کی روایت

○ معتزلہ اور شیعہ

○ ابنِ ابی الحدید اور تشیّع

حضرت علیؑ مرتضیٰ کی ولادت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے علمی تبحر اور دینی مرکزیت کی حیثیت کا طلسم تو اسی وقت ٹوٹ کے پاش پاش ہو گیا تھا جب "دو متضاد تصویریں" نامی کتابچہ منظرِ عام پر آیا تھا۔ جو مولانا کے مقصودِ نظر سے زیادہ خود موصوف کی متضاد تصویروں کا مرقع بن گیا تھا۔

اب مولانا کا اس سلسلے میں دوسرا شاہکار "المرتضیٰ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ کتاب کے مقدمے سے، جسے "سخن ہائے گفتنی" کا نام دیا گیا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حضرت علی مرتضیٰؑ پر ایسی کتاب لکھ رہے ہیں جس سے حضرت کی بے لاگ شخصیت قاری کے سامنے آجائے گی اور اس کمی کا تدارک ہو جائے گا، جو مولانا حضرت علیؑ کی سیرت نگاری کے ذیل میں محسوس کرتے ہیں۔ مولانا نے از راہ کرم شیعیانِ علیؑ پر بھی طنز فرمایا ہے کہ وہ بھی

حضرت کی مکمل سیرت پیش کرنے سے قاصر و عاجز رہے۔ جبکہ مولانا سے یہ بات مخفی نہ ہو گی کہ شیعہ علماء نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک بڑا حصّہ خود موصوف کے ارد گرد موجود ہے! اور انھیں تحریروں سے گھبرا کر اس سے قبل یہ الزام بھی لگ چکا ہے کہ یہ لوگ تو بس علیؑ کے لئے لکھتے ہیں پیغمبرؐ کے لئے کچھ نہیں لکھتے!! اور کیا مولانا موصوف کی اس "مفصّل سوانحِ حیات" کے بعد وہ "دبیز پردے" چاک ہو گئے یا اور زیادہ دبیز؟؟

پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ "خدا کو کسی نے نہیں پہچانا سوائے میں نے اور تم نے، مجھے کسی نے نہیں پہچانا سوائے تم نے اور اللہ نے۔ اور تمھیں اے علی کسی نے نہیں پہچانا سوائے میں نے اور اللہ نے"۔

ویسے مولانا کے اپنے ارشاد ہی سے اندک تامل کے بعد یہ بھید کھل جاتا ہے کہ مولانا حضرت کی سیرت نگاری میں قرآن وحدیث سے مواد نہیں لینا چاہتے۔ بلکہ اپنے عقائد کے آئینے میں حضرتؑ کا مرقع دکھانا چاہتے ہیں۔ ان سطروں کا راقم یہ بات اس لیے عرض کرتا ہے کہ پوری کتاب آپ پڑھ جائیں، کہیں اس میں نہ حضرت کے ان فیوض کا ذکر نظر آئے گا جو حضرت سے علم و ادب کو پہونچے نہ آپ حضرت کی قضاوت کے معرکہ آرا واقعات کا حوالہ پا سکیں گے

بلکہ جہاں بھی بن پڑا ہے، حضرت کے طرّہ ہائے کمال سے دوسروں کی دستارِ فضیلت سجانے کی سعی لاحاصل سے باز نہیں رہے ہیں۔ مولانا کی اتنے پر بھی تسکین نہیں ہوئی بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ حضرت کے فضائل و کمالات و خصائص کی گِن گِن کے تردید کرنا ہے۔

مثلاً حضرت علیؑ کی خانۂ کعبہ میں ولادت کا انکار صریحاً ممکن نہ تھا، اسلئے پہلے تو اس شرف میں حکیم بن حزام کو شریک کیا، پھر عبارت ایسی لکھی کہ "اقرار بھی ہے انکار بھی ہے" کا مزہ اور مقصد کا سمجھنا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے، کا لطف مل جائے۔ آخر قلم تو متضاد تصویروں کا ہی عادی ہے۔

اب آپ مولانا کے قلم کی شعبدہ آرائی ملاحظہ فرمائیں:

"حاکم نے حکیم بن حزام کے حالات میں لکھا ہے
یہ تواتر سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنتِ اسد کے بطن سے
سیدنا علی کرم اللہ وجہہ خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے
اور حکیم بن حزام بھی کعبہ میں پیدا ہوئے تھے"۔ [۱]

حضرات علمائے اہلِ سنّت کی اس کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے جو اس حقیقت کی مقر ہے، مولانا کو یکسر انکار کی تو جرأت نہ ہوئی لیکن ابن ابی الحدید معتزلی کا ایک اقتباس اس طرح پیش فرما دیا کہ کچھ کہنا بھی نہ پڑے اور مطلب بھی نکل جائے اور

---

[۱] المرتضیٰ صد ۴۹

اپنے مختار کو تقویت پہونچانے کی غرض سے ابن ابی الحدید کو "شیعہ" بھی ٹھہرا دیا ہے ۔ حالاں کہ اس کے معتزلی ہونے سے کسی کو انکار نہیں اور سب مانتے ہیں کہ اعتزال اور تشیع ایک جگہ نہیں پائے جا سکتے ہم انشاء اللہ اس کے تحقیقی تجزیے کی کوشش آگے چل کے کریں گے پہلے ہم نفسِ مسئلہ کو لیتے ہیں یعنی حضرت علی کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی اور کیا حکیم بن حزام بھی وہیں پیدا ہوا تھا؟

حضرت کی ولادت سراپا سعادت کے متعلق ابن صباغ مالکی فصول المهمہ میں کہتے ہیں :—

ولد علی علیه السلام بمكة المشرفة بداخل البيت الحرام فی يوم الجمعة الثالث عشر من شهر الله الاصم رجب الفرد سنة ثلاثين من عام الفيل.....
ولم يولد فی بيت الحرام قبله احد سواه وهی فضيلة خصّه الله تعالیٰ بها اجلالاً له اعلاء المرتبة واظهاراً لتكرمة [1]

" حضرت علی علیہ السّلام مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کے اندر روز جمعہ ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل پیدا ہوئے .... اور خانہ کعبہ کے اندر ان کے سوا کوئی پیدا نہیں ہوا ۔ یہ فضیلت ہے

[1] فصول المهمہ ص ۲۹

جسے اللہ نے ان کی جلالت کو ظاہر کرنے اور ان کے مرتبہ کو بلند کرنے نیز کرامت کے اظہار کے لئے ان سے مخصوص کیا ہے"۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن یوسف الکنجی شافعی کفایۃ الطالب میں لکھتے ہیں:

ولد امیر المومنین علی بن ابی طالب بمکۃ فی بیت اللہ الحرام لیلۃ الجمعۃ لثلث عشرہ لیلۃ خلت من رجب سنۃ ثلثین من عام الفیل ولم یولد قبلہ ولا بعدہٗ مولود فی بیت اللہ الحرام سواہ اکراما لہ بذٰلک واجلالاً لمحلہ فی التعظیم

" امیر المومنین علی بن ابی طالب شب جمعہ اللہ کے گھر خانہ کعبہ میں رجب کی تیرہ ۱۳ راتیں گزر جانے کے بعد مکّہ میں پیدا ہوئے عام الفیل کا ۳۰ سنہ تھا۔ ان سے قبل یا بعد کوئی بھی مولود خانہ کعبہ میں پیدا نہیں ہوا یہ صرف ان کے اکرام کے لئے تھا اور ان کی جلالت کو واضح کرنے کے لئے اور ان کی تعظیم کے لئے ہوا۔"

شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم دہلوی جو مصنّف "تحفہ اثنا عشریہ فی الرد علی شیعہ" کے والد ہیں، اپنی ازالۃ الخفاء میں

رقمطراز ہیں:۔

تواترت الاخبار ان فاطمة بنتِ اسد ولدت
امیرالمومنین علیاً فی جوف الکعبة
فانه ولد فی یوم الجمعة ثالث عشر من
شهر رجب بعد عام الفیل بثلثین سنة
فی الکعبة ولم یولد فیها احد سواه
قبله ولا بعدهٗ

"متواتر اخبار ہیں کہ فاطمہ بنتِ اسد کے بطن سے امیرالمومنین علی خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت روز جمعہ ۱۳ رجب سنہ ۳۰ عام الفیل خانہ کعبہ کے اندر ہوئی اور اسی خانہ کعبہ میں ان کے علاوہ کوئی نہ پہلے پیدا ہوا نہ بعد میں۔"

شہاب الدین سید محمود الآلوسی مشہور مفسر قرآن اپنی کتاب "شرح قصیدہ عینیہ" میں اس شعر پر پہونچ کرے

انت العلی الذی فوق العلیٰ رفعا
ببطن مکة عند البیت اذ وضعا

لکھتے ہیں:۔

وکون الامیر کرم اللہ وجہہ ولد فی البیت

امر مشهور فی الدنیا وذکر فی کتب الفریقین السنة والشیعہ۔ الی ان قال وما احریٰ بامام الائمة ان یکون وضعہ فیما ھو قبلة للمومنین وسبحان من یضع الاشیاء فی مواضعھا و ھو احکم الحاکمین

"خانہ کعبہ میں امیر المومنینؑ کی ولادت دنیا میں ایک مشہور امر ہے جس کا تذکرہ سنّی وشیعہ کتب میں موجود ہے"
اور آگے چل کر لکھتے ہیں: امام الائمہ کے لئے کتنی مناسب بات ہے کہ ولادت کے لئے وہ جگہ ہو جو مومنین کا قبلہ ہے پاک وپاکیزہ ہے وہ ذات جو اشیاء کو اس کی مناسبت سے قرار دیتا ہے اور وہی احکم الحاکمین ہے۔" [1]

مُلّا مبین فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں: ـــــــ

"روایت کی گئی ہے کہ حضرت علی خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے اور آپ کے علاوہ کوئی کبھی کعبہ میں نہیں پیدا ہوا اللہ نے آپ کے ساتھ یہ فضیلت مخصوص رکھی اور کعبہ کو یہ شرف دیا۔" [2]

---

[1] شرح قصیدہ عینیہ ص ۱۵
[2] وسیلۃ النجاۃ ص ۱۴۹

ابن بطریق شمس الدین ابوالحسین یحییٰ حلّی (وفات سنہ ۶۰۰ھ) اپنی کتاب عمدة میں لکھتے ہیں: ———

لم یولد قبله ولا بعده مولود فی بیت الله سواهٗ

"آپ کے علاوہ نہ آپ سے قبل کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہوا نہ آپ کے بعد"۔

بہاء الدین اربیلی (وفات سنہ ۶۹۲ھ) کشف الغمہ میں یوں رقمطراز ہیں کہ: ———

لم یولد فی البیت احد سواه قبله ولا بعدهٗ وهی فضیلة خصه الله بها اجلالا لهٗ واعلاءً لمرتبة واظهاراً لتکرمته[1]

"خانہ کعبہ کے اندر آپؑ کے علاوہ کسی کی پیدائش نہ آپ سے قبل ہوئی اور نہ آپؑ کے بعد۔ یہ فضیلت ہے جسے اللہ نے آپؑ کی جلالت کو ظاہر کرنے کے لئے، آپؑ کے مرتبے کو بلند کرنے اور کرامت کے اظہار کے لیے آپؑ سے مخصوص کیا ہے"۔

[1] کشف الغمہ ص ۱۹

مولانا جامی نے فرمایا ؎

بسوئے کعبہ رود شیخ من براہ نجف
برب کعبہ کہ ایں جامراست حق بطرف
تفاوتیکہ میانِ من و اُو ایں ہست
کہ من بسوئے گہر رفتم او بسوئے صدف!

خدائے سخن میر انیس فرماتے ہیں ؎

علی کو حق نے اتارا تو عین کعبہ میں
کھُلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا

مولانا معنوی فرماتے ہیں ؎

اے شہ دشت نجف از تو نجف دیدہ شرف
تو دری کعبہ صدف متاں سلامت من کند

ان علمائے اعلام اور محدثینِ کرام کے بیانات کے بعد ایک ابن ابی الحدید کی تنہا رائے کا سہارا لے کر اس شرف سے حضرت کو محروم کرنے کی سعیِ ناکام مولانا علی میاں کے شایانِ شان نہیں !! اب آیئے اس مسئلے کی دوسری شق پر نظر ڈالیں یعنی کیا حکیم بن حزام کی خانۂ کعبہ میں پیدائش کی روایت قابلِ قبول ہے ؟

جناب مصنّف نے یہ روایت بھی مستدرک حاکم سے لی ہے۔ لیکن اس کی تنقیح و تجزیہ میں اس باریک بینی اور ژرف نگاہی سے

کام نہیں لیا۔ جو حضرت عمر کی خانہ کعبہ میں ولادت کے واقعے کی تضعیف میں لیا گیا ہے۔

جنابِ مولانا سے یہ بات ہرگز مخفی نہیں ہو سکتی کہ اس کہانی کا کوئی بھی سراغ تیسری صدی ہجری سے قبل نہیں ملتا اور یہ جنابِ مولانا اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتے کہ یہ وہ دور ہے جسے "وضعِ حدیث وخبر" کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ مولانا کی بزرگ شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس شکوہ کا پورا حق رکھتے ہیں کہ مولانا نے اس سہولت کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا جو ازراہِ احسان یا ازراہِ اتفاق حاکم نے مستدرک میں کیا تھا۔ یعنی اس نے خبر کے راویوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر جناب مولانا کے پیشِ نظر منصفانہ تحقیق ہوتی تو وہ یقینی طور پر درایت کے مسلمہ اصولوں پر ان راویوں کی خبر لیتے لیکن مطلبِ سعدی تو دیگر ہی تھا اس لیے اس دشوار گزار وادی سے وہ قبائے تحقیق کا دامن بچاتے ہوئے آگے نکل گئے۔ "استاد بزرگ" کی اس فروگذاشت کی تلافی اس طالبِ علم کو کرنا ہے۔

اس روایت کا سرا ابوالفضل حسن بن یعقوب سے شروع ہوتا ہے، وہ ابواحمد بن عبدالوہاب سے نقل کرتا ہے وہ علی بن غنام عامری سے نقل کرتا ہے۔ اس سلسلۂ روایت میں ابواحمد بن عبدالوہاب کے علاوہ کوئی نہیں جو معروف ہو، سب کے سب مجہول ہیں۔ نہ صرف

مجہول الحال بلکہ مجہول العین ہیں۔ اس سلسلے میں تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، میزان الاعتدال، کاشف، ثقاب بن حبان اور تقریب گواہ ہیں۔ اور سب تو نکلے مجہول الحال اب بچے ابو احمد بن عبدالوہاب، تو ذرا دیکھئے ان کے بارے میں علماء درایت کا نظریہ کیا ہے۔

ان کے لیے ابن حجر کا تقریب میں یہ کہنا ہے کہ اصول ستہ میں سے امام نسائی کے سوا کسی نے ان سے روایت نہیں کی ہے اور ان کا شمار رجال کے طبقۂ حادی عشر میں کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ابن حجر آگے کہتے ہیں کہ عاشر تک وہ لوگ ہیں جنھوں نے تبع تابعین سے علم حاصل کیا اور حادی عشر وہ لوگ ہیں جنھوں نے تبع تابعین کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

رہ گئے علی ابن غنام عامری، اوّل تو ان کا ذکر کسی معتبر و معقول کتاب میں نظر آتا ہی نہیں اور اگر حسن ظن کے تقاضے سے ان کو "ثقہ" تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ حادی عشر ہی کی صف میں آئیں گے۔ بھلا کون ہے جو ان کی روایت ایک ایسے واقعہ کے متعلق تسلیم کرے گا جو بعثت سے بھی پہلے پیش آیا تھا؟

ہاں! یہ بات الگ ہے کہ ہمارے محترم مولانا کو ہر اس روایت سے کام لینا ہے جس سے فضائل اہلبیت میں ضعف پیدا کر سکیں۔

دوسری روایت وہ ہے جو حاکم نے مستدرک میں ذکر کی ہے ہم یہاں اس کی سند بلفظہ بیان کرتے ہیں : ـــــــ

اخبرنا ابوبکر محمد بن احمد حدثنا مصعب بن عبداللہ ...

یعنی مطلب یہ نکلا کہ مصعب پر آکے روایت کا سلسلہ ٹوٹ گیا، جن کے لئے ذہبی نے بتایا ہے کہ ان کی شخصیت میں علماء کو کلام ہے اور کچھ ذہبی پر منحصر نہیں، امام احمد بن حنبل بھی ان کی روایت کو درست نہیں سمجھتے۔ اور پھر ان باتوں کو جانے دیجئے۔ یہ دیکھئے کہ مولانا نے غضب یہ ڈھایا کہ اس پر بھی نظر نہیں ڈالی کہ خود حاکم نے یہ خبر لکھنے کے بعد اسی نوعیت کا اظہار خیال کیا ہے اسے ہم یہاں پیش کرتے ہیں : ـــــــ

وھم مصعب بن عبداللہ فی الحرف الاخیر

یعنی ـــ "اب اس آخری بات میں مصعب کو وہم ہوا ہے"۔ ورنہ

قد تواترت الاخبار ان فاطمہ بنت اسد ولدت امیرالمومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فی جوف الکعبہ

" اخبار متواتر یہ ہیں کہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب

کرم اللہ وجہہٗ کی ولادت فاطمہ بنت اسد کے بطن سے داخل خانۂ کعبہ ہوئی۔" [1]

جناب مولانا اس خبر کو بطور شہادت پیش فرماتے ہیں اور جس برتے پر یہ دعویٰ ہے یعنی حاکم وہ تو یہ مانتے ہیں کہ حکیم بن حزام کے واقعے میں مصعب کو وہم ہوگیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ فضائلِ اہلِ بیتؑ سے نفی و انکار کی منزل میں مولانا توہّمات کو بھی سند قبول بخش دیتے ہیں اور اثبات فضائل میں، حقائق کے اعتراف میں بھی متامل رہتے ہیں۔ بسوخت عقل ز حیرت ....

کیا اس استدلال کے بعد بھی حضرت امیر المومنین علیہ السّلام کی خانہ کعبہ میں ولادت کے شرف میں کسی اور کی شرکت ثابت ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی مولانا کی دیانت ہی کے ذمہ ہے کاش اب بھی تلافی مافات کے لئے مولانا اس مسئلہ پر غور فرمائیں۔ آخر اسے عموماً تسلیم کیا گیا ہے۔

کسے را میسّر نشد ایں سعادت
بہ کعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

اب ہم اس خطائے اجتہادی و مغالطہ "خاصۃ البلویٰ" کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں مولانا مبتلا ہیں: یا دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتے

---

[1] مستدرک للحاکم ج ۳ ص ۴۸۳

ہیں یعنی "معتزلہ" اور "شیعہ" ایک ہی چیز ہیں۔ مولانا نے حضرت کی فردانیت میں حکیم بن حزام کو شریک کرنے کی حکمت بھی اسی لیے اختیار کی لیکن اس پہلو پر توجہ نہیں کی کہ اگر معتزلہ کو بھی حریم تشیع میں داخل کر دیا گیا تو اس عددی اور نفری اکثریت کے دعویٰ کا کیا بنے گا، جس کے بل بوتے پر ہمارے اسلامی بھائی "سواد اعظم" ہونے کے دعوے دار ہیں۔ تب تو یہ سواد صغیر سے گھٹ کر اصغر تک پہونچ جائیں گے۔ کیوں کہ ان میں اشاعرہ کے سوا اور ہوگا ہی کون ۔؟

اب یہ فیصلہ مولانا کے اجتہاد پر معلق ہے کہ وہ حضرت کی ولادت خدا کے گھر میں ہونے سے انکار کرتے ہیں یا معتزلہ کے شیعہ ہونے کی نفی فرماتے ہیں۔

یہ تو وہ جواب تھا جس پر ندوی صاحب کو غور کرنا ہے !!

اب ہم نوجوان عزیزوں اور طلبار کی سہولت کے لیے عقیدے کے اصل فرق کو مختصر طور پر واضح کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

شیعوں کے اصول دین تین ہیں جو توضیحی اعتبار سے پانچ کے نام سے بیان کیے جاتے ہیں۔ توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت۔

اسلامی عقائد کا سطحی سے سطحی طالب علم بھی جانتا ہے کہ تشیع اور تسنّن کی حدِ فاصل امامت کا مسئلہ ہے اور اس مسئلہ میں

اختلاف نے معتزلہ کو تشیع کے دائرے سے خارج کر دیا ہے کیوں کہ وہ بھی اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ خداوند کریم نے حضرت ختمی مرتبت کے بعد اپنی خلق کی رہنمائی کا کوئی نظم نہیں کیا اور مسئلہ لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ ابن ابی الحدید کی طرف نسبتِ تشیع مبنی بر حقیقت ہے یا نہیں؟ تو اس کے لیے آپ خود ان کا اقبال و اعتراف ملاحظہ فرمائیں:

اتفق شيوخنا كافةً رحمهم الله المتقدمون منهم والمتاخرون البصريون والبغداديون على ان بيعة ابى بكر الصديق بيعة صحيحة شرعية وانها لم تكن عن نص وانما كانت بالاختيار الذى ثبت بالاجماع [1]

"ہمارے تمام شیوخ خدا ان پر رحم فرمائے، چاہے وہ متقدمین ہوں یا متاخرین بصری ہوں یا بغدادی سب اس بات پر متفق ہیں کہ ابو بکر کی بیعت صحیح اور شرعی تھی اور بے شک وہ کسی نص کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ اسے اختیار کیا گیا اجماع کی بنا پر۔"

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۷

اور ———

ان ابابکر افضل من علی علیہ السلام وھٰولاء یجعلون ترتیب الاربعۃ فی الفضل کترتیبھم فی الخلافۃ [1]

"ابوبکرؓ علیؑ سے افضل تھے۔ اور یہ تمام ہمارے شیوخ ان چاروں خلفاء کی ترتیب کے حساب سے ان کی فضیلت کے قائل ہیں۔"

واما نحن فنذھب الی ما یذھب الیہ شیوخنا البغدادیون من تفضیلہ علیہ السلام [2]

اور ہمارا نظریہ وہ ہے جو ہمارے بغدادی علماء کا ہے یعنی حضرت علی کو حضرت ابوبکر (خلیفہ اوّل) پر فضیلت حاصل ہے۔

البتہ ہم خلق قرآن اور اختیار میں شیعوں کے ہم مسلک ہیں مگر معتزلہ اپنے پانچوں اصولوں کے ساتھ ساتھ اس بات کے قائل ہیں کہ:

ان الامامۃ اختیار من الامۃ وذٰلک ان اللہ عزوجل لم ینص علی رجل

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ص۷ ج۱ [2] ایضاً ص۹ ج۱

بعینہ ولا رسولہ ولا اجتمع المسلمون
عندہ علیٰ رجل بعینہ وان اختیار
ذٰلک مفوض الی الامۃ سواء کان
قرشیا اوغیر من اھل ملۃ الاسلام
وسائرفرق الشیعۃ والرافضۃ والراوندیہ
الیٰ ان الامامۃ فی قریش[1]

" امامت امّت کے اختیار کی چیز ہے اور وہ اسلئے کہ خداوندعالم کی طرف سے کسی شخص معین کے لیے کوئی نص نہیں ہے اور نہ ہی ان کے رسول کی طرف سے کوئی معین ہوا اور نہ مسلمانوں نے پیغمبر کی زندگی میں کسی خاص شخص کے لئے اجماع کیا البتہ یہ اختیار اُمّت کو دے دیا گیا..... چاہے وہ قریش ہو یا کوئی غیر، پس ملّتِ اسلام سے ہونا چاہیئے ۔ اور دوسرے فرق جیسے "شیعہ" "رافضہ" اور راوندیہ کا یہ نصب العین ہے کہ امامت قریش میں رہے گی ۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام اور دوسرے ائمہ نے اکثر ان معتزلہ سے مناظرہ کیا ہے اور ان کو ہمیشہ دعوتِ حق دی ہے ۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید

کیا اب بھی جنابِ مولانا ابنِ ابی الحدید کے اہلِ سنّت ہونے سے انکار اور اس کے معتزلی شیعہ ہونے پر اصرار فرمائینگے ؟!
مولانا کے توازنِ طبع سے کیا یہ توقع کی جائے کہ وہ ابنِ ابی الحدید کی اور باتوں کو بھی اسی طرح سے لقمۂ تر بنائیں گے جیسا کہ حضرت کی ولادت کے سوال پر اس کے بیان کو بنایا ہے خاص طور سے حضرت کے اور مبینہ خلفاء راشدین کے تعلقات پر۔؟ کاش مولانا اسے تسلیم کرنے کے لیے موفّق ہو جائیں۔

۲

باب دوم

- مواخاۃ
- مواخاۃ کی تکرار
- بانیِ مذہبِ وہابیت کا اعتراف
- جنابِ معصومہ سے عقد
- مسجدِ نبویؐ میں دروازہ
- جنابِ ابو طالب
- ابو طالب نے بت پرستی نہیں کی
- ابو طالب کے اشعار
- کلمہ کیوں پڑھوایا گیا؟
- ابو طالب کا اندازِ نصرت
- رسول اللہ صلعم کی نیابت
- سورہ برأت

مواخاۃ

فاضل مصنّف نے اپنی زیرِ نظر کتاب کا دوسرا باب حضرت کی ہجرت سے وفات تک کے کوائف سے مخصوص کیا ہے اور اس میں سب سے پہلے مواخات کی ذیلی سرخی قائم کرکے گفتگو فرمائی ہے۔

ہم اصطلاح مواخات کی وضاحت چند لفظوں میں کردیں۔

، ہجرت کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے آپس میں بھائی چارہ بڑھانے اور تعلقات میں وسعت دینے کے لیے مختلف افراد کے درمیان رشتۂ اخوت قائم کرنے کا اعلان کیا۔ صحابہ اور انصار میں سے جو افراد ہم مزاج وہم خیال تھے ان کو آپس میں بھائی قرار دیا۔ جیسے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر کا بھائی، طلحہ کو زبیر کا بھائی عبدالرحمٰن بن عوف کو عثمان کا بھائی بنایا۔ اور حضرت امیرؑ کو

اپنا بھائی بنا کر ایک اور سندِ امتیاز بخشی۔ ظاہر ہے کہ حضرت مصنّف نے حضرت امیرؑ کی مظلومیت پر اسی خیال سے ترس کھایا ہے کہ فضیلت کے ایک ایک نشان کو مخدوش و مجروح کر دیں۔ وہ اپنے امتیازی شرف کو نظر انداز کیے بغیر کیسے بیان کر سکتے تھے اس لئے اس میں بھی مین میکھ نکالنا شروع کر دی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"ابن سعد کی الطبقات الکبریٰ میں مذکور ہے:

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب اور سہل بن حنیف کے درمیان بھائی چارگی (مواخاۃ) کا تعلق قائم کیا۔

ابنِ کثیر نے بیان کیا:

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اور سہل بن حُنیف کے درمیان مواخاۃ کرائی۔

ابن اسحاق نیز متعدد سیرت ومغازی کے مؤلفین نے ذکر کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کی مواخاۃ خود اپنی ذات سے قائم کی۔ اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں چند احادیث کی اسناد ضعیف ہیں، اور بعض احادیث کے متن میں بھی کمزوری ہے۔" (المرتضیٰ ص۶۳)

مولانا کا یہ ارشاد بس جی بہلانے کے لئے ہے، ورنہ نہ سند ہی ضعیف ہے اور نہ متن ہی میں کوئی کمزوری ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ابنِ ہشام اپنی سیرت میں کہتے ہیں:

ثم اخذ بید علی بن ابی طالب فقال هٰذا اخی فکان رسول الله سید المرسلین وامام المتقین و رسُول رب العٰلمین الذی لیس لهٗ خطیر ولا نظیر من العباد وعلی بن ابی طالب آخرین [۱]

"اس کے بعد آپ نے حضرت علی بن ابی طالب کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "یہ میرا بھائی ہے"۔ کیوں کہ رسُول اللہ سید المرسلین امام المتقین رسُول ربّ العالمین تھے اور بندوں میں سوائے علی بن ابی طالب کے کوئی شخص آپ کا ہم پلّہ و مثل نہ تھا۔"

ابنِ حجر نے ابنِ تیمیہ کا اعتراض بڑی صفائی اور خوبی سے رد کیا ہے۔ ابن تیمیہ اس جماعت کے سرخیل ہیں جس میں جناب ندوی کو "مجدد" کا مقام حاصل ہے۔ یعنی جیسے بھی بن پڑے اہلبیت اطہار کے فضائل کا یکسر انکار کیا جائے اور فدک کی طرح فضائل بھی

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۰۹، تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱، حبیب السیر ج ۱ ص ۳۷ فتح الباری ص ۷،

غصب کر کے اوروں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ چونکہ مواخات نے حضرت کی افضلیت کا سکّہ جما دیا تھا اس لیے اس کو کھوٹا بنانے کی سعیِ لا حاصل ہی ابن تیمیہ کا پہلا نصب العین تھا۔ امام تیمیہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ: "

" یہ تو پہلے ہی سے ایک دوسرے سے محبّت کرتے تھے"

اب ابنِ حجر کا یہ استدلال ہے کہ بے چارہ ابن تیمیہ مواخاۃ کی مصلحت ہی سمجھنے سے قاصر رہا۔ لیکن ابنِ حجر خود بھی کامل الایمان نہ تھے اس لیے وہ بھی مرکزی نقطہ تک پہونچنے سے قاصر رہے۔ بس یہ کہا کہ چوں کہ بچپن سے ساتھ رہتے آئے تھے اس لیے ایسی مواخات کے لئے حضورؐ نے حضرت کا انتخاب فرمایا:

ظاہر ہے کہ مواخات کی بنیاد اتنی مختصر نہ تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ مواخات میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے ہم مشربی و ہم مزاجی منظورِ نظر تھی، ورنہ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ دو بھائیوں میں معنوی مماثلت نہ ہو، آخر ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کے بھی تو کوئی معنی ہوتے ہیں۔ جبکہ اس کی تائید فکرِ قرآنی

"کلّ حزب بما لدیھم فرحون"

سے بھی ہوتی ہے اور یہ بات ایسی ہے جیسا کہ امام احمد بن

حنبل حذیفہ سے نقل کرتے ہیں :

اخی رسول اللہ بین المھاجرین والانصار کان یواخی بین الرجل و نظیرہ ثم اخذ بید علی فقال ھذا اخی [1]

" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کی اور آپ نے ہر شخص کو اس کے نظیر کے ساتھ بھائی بنایا اس کے بعد حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا یہ میرا بھائی ہے "

یہ بات بھی مولانا بخوبی جانتے رہے ہوں گے کہ یہ واقعہ ایک دفعہ کا نہیں ہے بلکہ فاتحۃ الکتاب کے نزول کی طرح اس کا وقوع بھی مثانی کا رتبہ رکھتا ہے، یعنی حضور کو اس کا اہتمام اس درجہ منظور تھا کہ عقد مواخاۃ قبل ہجرت مکہ میں بھی بندھوایا گیا اور بعد ہجرت مدینہ میں بھی، اور کیا یہ محض اتفاق تھا کہ دونوں بار دونوں جگہ اپنا بھائی بنانے کے لئے فردِ واحد ہی کو منتخب فرمایا فاعتبروا یا اولی الابصار اور رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کیوں نہ کرتے جبکہ جانتے تھے

---

[1] مسند احمد بن حنبل

کہ عرب کا مزاج کیا ہے۔ جو حضرات خلعتِ اسلام سے مشرّف ہوئے ہیں، ان کے بطون کی کیا حالت ہے باہمی ہمدردی ومواساۃ کا کیا حال ہے۔ اسی لئے اخوت کے فضائل بار بار بیان کیے اور متعدد بار مواخاۃ قائم کی اور یہ سلسلہ جاری ہے مگر حضرت امیرؑ پر ابھی حضورؐ کی نظر انور نہیں پڑ رہی ہے۔ مولانے شکوہ آمیز لہجے میں اس کی وجہ دریافت فرمائی۔

حضرت امیرؑ کو سینے سے لگا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا بھائی قرار دیا اور صرف دُنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی ـــــ

"انت اخی فی الدنیا والآخرۃ۔"[1]

افسوس کہ تاریخ نے اس کی تصریح نہیں کی ہے کہ جن دیگر حضرات نے مواخاۃ فرمائی تھی وہ محض دُنیا کے لئے تھی یا آخرت کے لئے بھی۔

اب اس سوال کا جواب منکر مواخاۃ کے ذمّہ ہے کہ اگر حضورؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بھائی نہیں بنایا تو پھر کس کو اپنا بھائی بنایا۔ کیا حضرت اس سے مستغنی تھے!

---

[1] ترمذی، صواعق محرقہ ص۱۸۸ مستدرک الصحیحین للحاکم ج ۳ صفحہ ۱۴

مواخاۃ کا تذکرہ مشہور مصری عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی "علیؑ و بنوہ" میں تفصیل سے کیا ہے۔

آخرِ بحث میں بانیٔ مذہبِ وہابی کی بات بھی سُن لیجیے:

انہ آخی بین المھاجرین بعضھم مع بعض مواخاۃ ثانیہ۔ واتخذ فیھا علیاً اخاً لنفسہٖ[۱]

یعنی: "پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین کے درمیان بعض سے بعض کی اخوت دوسری مرتبہ (پھر) قائم کی اور اس دفعہ (بھی) علی کو اپنا بھائی بنایا۔"

---

[۱] مختصر سیرۃ الرسولؐ لشیخ الاسلام مجدد القرن الثانی عشر محمد بن عبدالوہاب ص ۱۵۷

جنابِ معصومہؑ کا حضرت علیؑ سے عقد

جنابِ فاطمہ زہراؑ اور مولائے کائنات کے عقد کا ذکر جناب مولانا نے ضرور کیا ہے، اس ذکر کے بغیر چارۂ کار نہ تھا۔ ناچار مولانا نے بھی ذکر فرمایا، لیکن اختصار اس درجہ کا برتا ہے کہ شادی سے پہلے کے بعض نہایت اہم تاریخ ساز اور سمت نما حقائق کی چھاؤں بھی نہ پڑنے دی۔ مثلاً اس مناسبت کے لیے بعض صحابہ کی استدعائیں اور دربارِ رسالتؐ سے انکار اور محض انکار ہی نہیں، ایک طرح سے درخواستوں کا بیک جنبشِ قلم مسترد اور مردود کر دیا جانا۔ لیکن مہماتِ مسائل سے اعراضِ کلّی کے باوصف اس پرچار میں کوئی کمی نہ ہونے دی کہ ــــــ

"قابلِ وثوق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدّیق نے حضرت علی کی حضرت فاطمہ سے شادی کے موقع پر سامان خریدنے اور جہیز تیار کرنے کے سلسلے میں مدد کی۔"[1]

روایت کا ماخذ جناب شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی کی "امالی"

[1] المرتضیٰ صہ ۶۴

مطبوعہ نجف کو بنایا۔ کیوں ؟ تاکہ حضرتِ ابوبکر کی کم ازکم ایک فضیلت تو شیعہ ماخذ سے ثابت ہو سکے !!

حالاں کہ حضرت مولانا خوب جانتے ہیں کہ جس کا خصوصی تذکرہ فرما رہے ہیں وہ مرگِ مفاجاۃ تھی۔ یعنی اس وقت حکم حاکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی اور مالی مدد کا سوال ہی نہ تھا وہ تو خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے پاس سے نہیں فرمائی تھی۔ رقم حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زرہ فروخت کر کے خدمتِ رسالت میں پیشگی ادا کر دی تھی۔ کیوں کہ حضور کو مطلوب ہی یہی تھا۔ اس رقم سے بازار کرنے کا حکم کئی صحابیوں کو ہوا تھا حضرت ابوبکر بھی ان میں سے ایک تھے۔ اب اس فضیلت کو مولانا جس طرح چاہیں پیش کریں۔

ہم جنابِ مصنّف کے توازن بلکہ ان کی فراخدلی کی داد دیتے اگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی بتا دیتے کہ جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کا رشتہ مولائے کائنات سے طے ہونے سے قبل کن کن مشائخ کی درخواستیں رد ہو چکی تھیں۔ فاضل مصنّف نے اخفائے حقائق سے کام لے کر فنکاری کے ساتھ خیانت کی ہے۔ بے لاگ تاریخ نویسی کا مطالبہ تھا کہ مصنف محترم یہ تعب برداشت فرمائیں لیکن اس سے ان کی مراد کو گزند پہونچ رہی تھی اس لئے تاریخ کا خاکہ

ناممکل چھوڑ دیا۔ اس کی تلافی ہم کرتے ہیں۔ آپ یہاں بقدرِ ضرورت اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

روی ان ابی بکر خطب فاطمة۔ فقال له نبی یا ابا بکر انتظر بها القضاء ثم خطبها عمر فقال له مثل ما قال لابی بکر روی بریدة قال اتی علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم فقال ماحاجتك یا بن ابی طالب فقال ذکرت فاطمة۔ فقال مرحباً و اھلاً۔

"حضرت ابوبکر نے آنحضرت سے فاطمہ کی خواستگاری کی تو آپ نے فرمایا کہ اس امر میں وحی الٰہی کا منتظر ہوں۔ پھر حضرت عمر نے آنحضرت سے فاطمہ کی خواستگاری کی، ان سے بھی یہی کہہ کر انکار کر دیا۔ بریدہ کہتے ہیں کہ پھر حضرت علی آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فاطمہ کی خواستگاری کی۔ حضور نے مسرور ہو کر فرمایا مرحباً و اہلاً۔"

صواعق محرقہ اور مسند احمد بن حنبل میں ابن عمر سے منقول ہے کہ بابا فرمایا کرتے تھے کہ علی مرتضیٰ کو تین ایسی فضیلتیں حاصل ہو گئیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک مجھے حاصل ہوتی تو میں

اسے سُرخ اونٹوں سے زیادہ گراں قدر سمجھتا۔ وہ تین فضیلتیں یہ ہیں:

۱۔ حضور نے بتول کو ان کو عنایت فرمایا۔
۲۔ حضرت کا دروازہ مسجد رسُول میں کھلا رکھا۔
۳۔ خیبر کے دن علم لشکر عنایت کیا۔

اخرج الطبرانی عن جابر والخطیب عن ابن عباس ان النبیّ قال! ان اللہ جعل ذریۃ کل نبی فی صلبہ وجعل ذریتی فی صلب علی بن ابی طالب[۱]

"طبرانی نے جابر سے اور خطیب نے ابنِ عباس سے روایت کی ہے کہ رسُول خدا نے فرمایا کہ خدا نے ہر نبی کی اولاد کو اس کے صلب میں قرار دیا لیکن میری اولاد کو صلب علی ابن ابی طالب میں قرار دیا"۔

عن ابی عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہُ علیہ وآلہ وسلم اللّٰھُمَّ اشھد انی قد بلغت ھٰذا اخی وابن عمی وصھری

---

[۱] صواعق باب تاسع فصل ثانی حدیث ۲۷

وابو ولدی. اللھمّ خبّ من عاداہ فی النّار[1]

" ابن عباس سے روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درگاہِ احدیت میں عرض کی خداوندا! تو گواہ رہنا کہ میں اپنی امّت تک یہ بات پہنچا چکا ہوں کہ یہ میرا بھائی ہے۔ میرے چچا کا بیٹا ہے میرا داماد ہے اور میرے بچّوں کا باپ ہے۔ خداوندا! جو اس سے دشمنی کرے تو اسے دوزخ میں ڈال دے"۔

عام طور سے محدثین اور مورخین اس محل پر اس فضیلت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد اکثر اصحاب نے اپنے مکانات مسجد سے ملحق بنوائے تھے اور ان کے دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے تاکہ مسجد میں آنے جانے میں سہولت رہے۔ لیکن اس طرح کی آمد و رفت میں صحابہ ہر حالت میں مسجد میں آنے جانے لگے جس سے مسجد نبوی کی حرمت پر آنچ آئی۔ یہ منظور مشیت نہ ہوا۔ چنانچہ پیغمبر کو حکم ہوا کہ ان تمام صحابہ کے دروازے بند کرا دو۔ بس ایک علی کے مکان کا دروازہ کھلا رہنے دو۔

یہ حکم الٰہی بھی بعض صحابہ کے لئے جرح و قدح کا موضوع بنا اور چہ میگوئیاں

---

[1] ارجح المطالب باب سوم ص ۲۲۴ مطبوعہ (۱۳۳۵ھ)

شروع ہوگئیں۔ حضرت کو معلوم ہوا تو منبر پر تشریف لے گئے، اور صورت حال کی وضاحت کردی کہ جو کچھ ہوا ہے وہ حکم الٰہی سے ہوا ہے۔[1]

اس کثرت سے اس فضیلت کا ذکر تمام اہم اور غیر اہم مدارک میں ہونے کے باوجود جناب ندوی صاحب نے اس فضیلت کے ذکر کی ضرورت نہیں محسوس فرمائی۔ خدا ہی جانے کہ وہ مظلوم شخصیت کی تائید فرما رہے ہیں یا مظلومیت کی گراں باری کچھ اور بڑھا رہے ہیں غضب تو یہ ہوا کہ اس کا بھی لحاظ نہیں فرمایا کہ حضرت "فاروق اعظم" نے اس فضیلت پر رشک فرمایا تھا۔ اسی حوالے سے اس فضیلت کا ذکر فرما دیتے۔ مگر ندوی صاحب "مفصل" سوانح حیات میں بھی اس کے لئے گنجائش نہ نکال سکے۔

عن زید بن ارقم والبراء بن عازب قال نفر من اصحاب رسول اللہ ابواب شارعہ فی المسجد فقال النبی سدوا الابواب الا باب علی فقال فتکلم فی ذلک الناس

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۷۵، مستدرک للحاکم ج ۳ ص ۱۱۷۔ صواعق محرقہ جلال الدین سیوطی۔ تفسیر در منثور۔ سبط بن جوزی

فقام رسول اللّٰہ فحمد للّٰہ واثنی علیہ وقال امابعد امرت بسد ھٰذہ الابواب غیر باب علی فقال قائلکم..... انی واللّٰہ ماسددت شیئاً و فتحتہ ولکن امرت بشئٍ فاتبعتُہ [1]

"امام احمد بن حنبل، نسائی اور حاکم نے زید بن ارقم اور براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ چند اصحاب رسول کے دروازے مسجد کے اندر کھلتے تھے۔ آنحضرت نے حکم دیا کہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں۔ اس پر چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ جب آنحضرت کو یہ معلوم ہوا تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور خداوند عالم کی حمد وثناء کے بعد فرمایا مجھے خداوند عالم کی طرف سے حکم ملا تھا کہ علی کے سوا سب کے دروازے بند کرا دوں تم لوگ اس پر نکتہ چینی کرتے ہو۔ خدا کی قسم نہ میں نے کسی چیز کو بند کیا ہے اور نہ کھلوایا۔ البتہ مجھے جو حکم ملا تھا اس کی تعمیل کی۔"

انی امرت بسد ھٰذہ الابواب غیر باب علی [2]

---

[1] احمد و نسائی و حاکم [2] صواعق محرقہ ص۱۹۱ حدیث نمبر ۲۴

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمام دروازوں کو بند کر دوں
سوائے علی کے دروازے کے"

جناب ابوطالب

المرتضیٰ نامی کتاب جناب علی میاں ندوی نے سرکاری میڈیا کے پورے استعمال کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے بخیال خویش اسی لئے پیش کی کہ حضرت امیر المومنین علیہ السّلام کی شخصیت پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا اور نہ کوئی حضرت کی شایان شان کتاب لکھی گئی۔ لیکن کتاب کیا ہے حضرت کے سبھی فضائل کو اختلافی بنا دینے کی چالاک منظم اور بھرپور کوشش ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا تھا ع

بکار خویش تو ہشیار نکلے تیرے دیوانے

ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا"[1]

حالاں کہ چند ہی سطر پہلے تحریر فرما چکے ہیں کہ پیغمبر نے جب بُت پرستی کی مخالفت کی تو سب دشمنی پر متفق ہو گئے لیکن ابوطالب یکساں آپ کی "حمایت و مدافعت" فرماتے رہے۔

---

[1] المرتضیٰ ص ۳۹

ایک اور جگہ تحریر فرمایا کہ جناب ابوطالب نے پیغمبر اسلام سے کہا کہ میرے عزیز! تم اپنا کام جاری رکھو اور جو کہنا چاہتے ہو کہو "بخدا" تم کو ان لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ شعب ابی طالب کی سختیاں خود ابوطالب نے برداشت کیں۔

کیا ندوی صاحب بتانے کی زحمت کریں گے کہ حضرت ابوطالب کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے۔

۱۔ بخدا تم کو ان لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا

۲۔ تم اپنا کام جاری رکھو اور جو کہنا چاہتے ہو کہو

وہ کون سا کام تھا جس کے جاری رکھنے کی فرمائش ہے اور وہ کون سی بات ہے جس کے کہنے کی تاکید ہے۔

بقول ندوی صاحب "بخدا" کہہ کے ابوطالب نے کیا اپنے موحد ہونے کے اقرار و اعلان کے سوا کوئی اور چیز ظاہر کی۔ کیا یہ لا الہ الا اللہ کے اقرار کے سوا کچھ اور تھا؟ اور جس بات کو کہتے رہنے کے لئے فرمایا تھا وہ تلاوت قرآن، بت پرستی کی ممانعت اور قولو لا الہ الا اللہ کی تکرار سے الگ کوئی چیز ہے

ظاہر ہے کہ ان سوالات کے جواب ندوی صاحب نہیں دیں گے۔ دے سکتے بھی نہیں۔ اس لیے ہم یہ عرض کرتے ہیں

کہ ندوی صاحب کے یہ جملے اس بات کے شاہد ہیں کہ جناب ابوطالب حضرت محمد بن عبداللہ کو رسول مانتے ہیں۔ صاحبِ کتاب و شریعت تسلیم کرتے ہیں۔ کلمہ ان باتوں کی شہادت کے سوا اور ہے کیا؟ یقینی طور پر اس طرح کلمہ صدق دل سے پڑھ لیا گیا۔

وہ کون سی چیز قبولِ اسلام کے علاوہ اور تھی جس نے ابوطالب کو رسول کی مخالفت و عناد سے روکا۔ جب کہ خاندان کے اور سبھی لوگ مخالفت کر رہے تھے اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام کی تبلیغ میں امداد و حمایت پر آمادہ کیا۔

یہ سب کچھ لکھ کے ندوی صاحب نے جناب ابوطالب کے اسلام و ایمان کو خود ہی تفصیل سے ذکر کر دیا۔ لیکن اپنے اس دعوے کا کہ ابوطالب اسلام سے مشرف نہ ہوئے تھے، کوئی ثبوت نہیں پیش کیا۔ البتہ بات ختم کرتے کرتے سرسری طور پر یہ لکھ گئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پے درپے مصائب پیش آئے۔ اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا۔

چلیے ندوی صاحب نے "عام الحزن" کو بھی معمولی سا معاملہ بتا کے اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کر ڈالی۔ لیکن کیا یہ بھی سوچا کہ کیا معاذاللہ "ایک کافر" کے مرجانے پر "عام الحزن" قرار دینے کا آپ رسول پر الزام لگا رہے ہیں یا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں

کہ اس شخص کی وفات کا رسُول کو غم و حزن نہیں ہوا ، جس نے بچپن سے حضرت کی کفالت کی جس نے کفار قریش سے آپ کے دفاع میں ڈٹ کر مقابلہ کیا؟ یہ وہی تھا جسکی ہیبت و دبدبہ کی بدولت کفار کسی سخت اقدام سے ڈرتے رہے۔ وہ سہارا رخصت ' وہ سپر شکستہ ' وہ قلعہ مسمار ہوگیا۔ اسی لئے " عام الحزن " اس سال کا نام پڑا۔ پیغمبر اسلام غیر مسلم کے سوگوار نہ تھے۔

لیکن حضرت ندوی کا تو مقصد ہی دوسرا ہے۔ خدمات کا اعتراف ، بادل نخواستہ ہی سہی ، کرنے کے بعد بھی دائرہ اسلام میں داخل سمجھنے کے لئے تیار نہیں !! جب کہ دوسروں کو بڑی سے بڑی مراعات دینے کے لئے رسّی دراز ہے۔ مگر وہ رعایت جو اوروں کو ملی بھلا وہ علیؑ کے باپ کو کیسے دی جا سکتی ہے جس سے انصاف ہی نہیں کرنا ہے اس سے رعایت کا کیا سوال ہے ؟

لیکن سب آپ کے ہی ایسے نہیں۔ علماء اسلام میں انصاف پسند افراد بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً جلال الدین سیوطی ، ابوالقاسم بلخی ، ابو جعفر اسکافی ، فقیہ شافی ، میر علی ہمدانی اور ابن ابی الحدید جیسے اکابر جناب ابوطالب کے اسلام کو تسلیم کر چکے ہیں ، اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کرم اللہ وجہہ

کہیں یا نہ کہیں، واقعہ تو یہ ہے کہ جناب ابو طالب نے بھی کبھی بُت پرستی نہیں کی۔

انہ لم یعبد صنماً قط بل کان من اوصیاء ابراهیم

ابن اثیر نے جامع الاصول میں تحریر کیا ہے:

ما اسلم من اعمام النبی غیر حمزہ وعباس وابی طالب عند اهل البیت علیهم السلام

"اہلِ بیتِ نبوی علیہم السلام کے نزدیک حضورؐ کے چچاؤں میں سے صرف حضرت حمزہ، عباس اور ابو طالب ایمان لائے۔"

اہلِ بیت کے فیصلے کو آپ حجت کہاں مانیں گے۔ حدیث ثقلین اور دوسری احادیث کے ذریعہ رسُول کی سفارش و وصیت کا نہ تو خیال ہے اور نہ من تخلف عنها غرق کا خوف۔ لیکن یہ تو ماننے گا کہ گھر کی بات گھر والے بہتر جانتے ہیں۔

ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ علمائے شیعہ کے علاوہ ہمارے بعض شیوخ علماء جیسے ابوالقاسم بلخی، ابو جعفر اسکافی وغیرہ بھی اسی عقیدے کے ہیں

کہ ابوطالب اسلام لائے لیکن اپنا ایمان ظاہر نہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری امداد کر سکیں اور مخالفین آپ کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مزاحمت نہ کر پائیں لہ

ان شہادتوں کے بعد بھی ابوطالب کے اسلام نہ لانے کی جتنی روایتیں ہیں وہ سب گھوم پھر کے مغیرہ بن شعبہ پر منتہی ہوتی ہیں اس کا چال چلن اور شیر خدا حضرت علی علیہ السّلام کے ساتھ اس کی عداوت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ اس سعی لاحاصل سے کیا فائدہ۔ جناب ابوطالب کے ایمان پر اتنی دلیلیں ہیں کہ مجالِ انکار نہیں۔ ملاحظہ ہوں:

(۱) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

انا وکافل الیتیم کھاتین فی الجنّۃ

"میں اور یتیم کا کفیل دال (دو انگلیوں کی طرح) جنت میں باہم ہوں گے۔"

ابن ابی الحدید اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ارشادِ رسول سے یتیم کی ہر کفالت کرنے والا نہیں ہو سکتا! اسلئے کہ کافل الیتیم فاسق وفاجر بلکہ گمراہ، بے دین اور مستحق جہنم بھی ہو سکتے ہیں۔ پس آنحضرت کی مراد جناب ابوطالب و جناب

لہ ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۳۱۰

عبد المطلب سے تھی جو حضرت کے کفیل رہے اور مکّہ میں آنحضرت "یتیم ابو طالب" کے لقب سے مشہور بھی تھے۔ کیوں کہ وفات جناب عبد المطلب کے بعد آٹھ سال کے سن سے حضرت کی کفالت و خبر گیری آپ ہی کے ذمّہ رہی، جس کا ندوی صاحب نے خود بھی ذکر فرمایا ہے اور سیرۃ ابن ہشام کے حوالے سے اس کا اعتراف بھی کیا کہ ہمیشہ حضرت کی حمایت و رفاقت کی۔

(۲) ایک اور مشہور حدیث ہے جسے شیعہ و سنّی محدثین نے مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان اللہ حرم علی النار صلبا انزلک وبطنا حملک وثدیا ارضعک وحجرا کفلک۔

"اللہ نے آگ پر حرام کر دیا ہے اس پشت کو جس سے آپ کا نزول ہوا۔ اس شکم کو جس نے آپ کا بار اٹھایا اس سینے کو جس نے آپ کو دودھ پلایا اور اس گود کو جس نے آپ کو کھلایا۔"

اس روایت کو حدیث قدسی کے طور پر سید علی ہمدانی نے "مودۃ القربیٰ" میں، شیخ سلیمان بلخی نے ینابیع المودۃ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ: